سوانح حیات

بابا تاج الدینؒ ناگپوری

مرتبہ

سہیل احمد عظیمی

مکتبہ روحانی ڈائجسٹ

۱-کے-۳/۱۴-ناظم آباد نمبر ۱ کراچی نمبر ۱۸

نام کتاب ——— سوانح حیات بابا تاج الدین ناگپوری

مرتب ——— سہیل احمد عظیمی

ناشر ——— حکیم وقار یوسف
مکتبہ روحانی ڈائجسٹ

سن اشاعت ——— سنہ ۱۹۸۵ء

قیمت ——— قیمت =/65 روپیہ

عارف باللہ خاتون،

مریم امّاں

کے نام

جن کے لئے

شہنشاہِ ہفت اقلیم حضرت بابا تاج الدینؒ

کا ارشاد ہے:

"میرے پاس آنے سے پہلے مریم امّاں کی خدمت میں حاضری دی جائے۔"

فہرست

عنوان	صفحہ
رُوحانی انسان ــــــــ	۱۳
حالاتِ زندگی ــــــــ	۱۹
نام اور القاب	۱۹
خاندان	۲۰
پیدائش	۲۰
بچپن اور جوانی	۲۱
فوج میں شمولیت	۲۲
دو نوکریاں نہیں کرتے	۲۳
نسبت فیضان	۲۵
پاگل جھونپڑی	۳۰
شکردرہ میں قیام	۳۴
واکی میں قیام	۳۵
شکردرہ کو واپسی	۳۷
معمولات	۳۸
انداز گفتگو	۴۰
رحمت و شفقت	۴۱
تعلیم و تلقین	۴۴
کشف و کرامات ــــــــ	۴۷
آگ	۴۸
مقدمہ	۴۹
طمانچے	۴۹
پتہ اور انجن	۵۰
سول سرجن	۵۱
قریب المرگ لڑکی	۵۱
اجنبی بیرسٹر	۵۲
دُنیا سے رخصتی	۵۳
جبل عرفات	۵۳
بحالی کا حکم	۵۵
دیکھنے کی چیز	۵۵
لمبی نکو کر دیے	۵۶
غیبی ہاتھ	۵۸
میڈیکل سرٹیفکیٹ	۵۹
مشک کی خوشبو	۶۱
شیرو	۶۲

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سرکشن پرشاد کی حاضری	۶۹	آدھی دولان	۹۶
لڈو اور	۷۰	کیوں دوڑتے ہو حضرت	۹۶
[illegible] موت	۷۱	دال بھات	۹۷
دست گیر	۷۲	ٹیکٹ، ناز	۹۸
دو تھال میں سب راستے	۷۳	علی برادران اور گاندھی جی	۱۰۰
بدکردار لڑکا	۷۴	بے تیغ سپاہی	۱۰۱
جسم نہیں ہے	۷۵	ہندو مسلم فساد	۱۰۷
یہ اچھا پڑھے گا	۷۶	بھوت بنگلہ	۱۱۰
بارش میں آگ	۷۷	پُراسرار قہقہہ	۱۱۰
چھوت چھات	۷۸	مٹی کی تصویر	۱۱۱
مناسکِ حج	۷۹	پُراسرار گاڑی	۱۱۲
ایک آدمی، دو جسم ؟	۸۲	معراج	۱۱۵
بڑے کھلاتے اچھے ہو جاتے	۸۳	بھیانک رات	۱۱۶
معذور لڑکی	۸۴	بڑا دیو	۱۱۹
کالے اور لال منہ بندر	۸۴	زہریلی چھپکلی	۱۲۲
سونا بنانے کا نسخہ	۸۵	ولی بنا دو	۱۲۳
درشن دیوتا	۸۶	احسان	۱۲۷
تحصیلدار	۸۹	دعا اور ترقی	۱۲۸
محبوب کا دیدار	۹۰	دیو کا راز	۱۳۱
پانچ جوتے	۹۲	اللہ اللہ کرکے بیٹھو جاؤ	۱۳۳
بیگم صاحبہ بھوپال	۹۲	شاعری	۱۳۷
فاتحہ پڑھو	۹۳	وصال	۱۴۰
ABDUS SAMAD SUSPENDED	۹۳	فیض اور فیض یافتگان	۱۵۱
دلیسی مال	۹۵	حضرت انسان علی شاہ	۱۵۲

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
مریم بی اماں	۱۵۷	حضرت محمد غوث بابا	۱۸۹
بابا قادر اولیاء	۱۶۰	قاضی امجد علی	۱۹۰
حضرت مولانا محمد یوسف شاہ	۱۶۴	حضرت فرید الدین کریم بابا	۱۹۲
خواجہ علی امیر الدین	۱۶۵	قلندر بابا اولیاء	۱۹۵
مہاراجہ رگھوجی راؤ	۱۷۰	سلسلہ عظیمیہ	۱۹۸
حضرت فتح محمد شاہ	۱۷۲	لوح و قلم	۲۰۰
حضرت کملی والے شاہ	۱۷۳	نقشے اور گراف	۲۰۰
حضرت رسول بابا	۱۷۳	رباعیات	۲۰۱
حضرت مسکین شاہ	۱۷۴	تذکرہ تاج الدین بابا	۲۰۳
حضرت اللہ کریم	۱۷۵	انسان فرشتے اور جنات	۲۰۶
حضرت بابا عبدالرحمٰن	۱۷۶	شیر کی عقیدت	۲۱۳
حضرت بابا عبدالکریم	۱۷۷	پتے کیڑے بن گئے	۲۱۷
حضرت حکیم الدین	۱۷۸	دیوار میں سے گزر جانا	۲۱۹
حضرت محمد عبدالعزیز عرف نانا میاں	۱۸۰	دو برس کا چلہ	۲۱۹
مہاتما آنند بابا نیل کنٹھ راؤ	۱۸۵	تنکے بیڑی بن جاتے تھے	۲۲۱
سکو بائی	۱۸۶	لنگڑا بیساکھی چھوڑ بھاگا	۲۲۱
بی اماں صاحبہ	۱۸۷	گوالا زندہ ہو گیا	۲۲۳
حضرت دوا بابا	۱۸۸		
نانی صاحبہ	۱۸۹		

اقتباس

- انسان پابہ گل ہے، جنّات پابہ ہیولیٰ ہیں، فرشتے پابہ نور۔ یہ تفکر تین قسم کے ہیں اور تینوں کائنات ہیں۔
- تفکر کے ذریعے ستاروں، ذرّوں اور تمام مخلوق سے ہمارا تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔ ان کی انا یعنی تفکر کی لہریں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس وضع کے تبادلۂ خیال کا ایک خاندان ہے۔
- خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے لاشمار تصویرخانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویرخانوں کو ہم اپنی زبان میں توہم، تخیل، تصوّر اور تفکر وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔
- سائنس داں روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کر دے۔ البتہ انا کی لہریں لامتناہیت میں بہ یک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔
- ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔
- ہم تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارے اور دوسرے سیاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت انا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

تذکرۂ تاج الدین باباؒ

تصنیف قلندر بابا اولیاءؒ

شہنشاہ ہفت اقلیم، تاج الملت والدین، حامل علم لدنی، واقف اسرار کائنات حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی ذات بابرکات پر قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حضرت بابا تاج الدینؒ کے نواسے اور سلسلۂ عظیمیہ کے بانی ابدال حق قلندر بابا اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ

"نانا تاج الدین جیسی برگزیدہ ہستی ساڑھے تین ہزار سال میں اللہ تعالٰی اپنے خصوصی کرم سے پیدا کرتا ہے۔ یہ ساری کائنات چار نورانی آبشاروں پر قائم ہے۔ نانا تاج الدین کی عظمت کا حال یہ ہے کہ نور اور تجلیات کی ان چاروں آبشاروں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتے ہیں کہ ایک قطرہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کا عالم یہ ہے کہ حضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرزند کی کوئی بات کبھی نامنظور نہیں کی۔"

بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے حالات اور کشف و کرامات پر گزشتہ ستر پچھتر سالوں میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں اردو کے علاوہ گجراتی اور ہندی زبان میں شائع شدہ کتابیں بھی ہیں۔ حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے علم و عرفان اور غیب و شہود کے وارث قلندر بابا اولیاءؒ نے تذکرہ تاج الدین بابا "

کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ روحانی دنیا میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں کشف وکرامات کی علمی توجیہ بیان کی گئی ہے اور بابا تاج الدین کے ان علوم کا ذکر کیا گیا ہے جن علوم کا تعلق براہ راست ان چار نورانی اشاروں سے ہے جو بابا تاج الدین رح کی رُوح کے اندر ہمہ وقت تسلسل اور تواتر کے ساتھ جذب ہوتی رہتی ہیں۔ تذکرہ تاج الدین بابا کی اشاعت کے بعد مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے مجھ سے بار بار کہا کہ حضرت بابا تاج الدین ناگپوری رح کے حالات زندگی پر ایک بھرپور کتاب لکھو

قانون یہ ہے کہ جب کسی ایک بات پر عارف باللہ کا ذہن مرکوز ہو جائے تو اس کا مظاہرہ ایک امر لازمی ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آنکھوں کے نور میرے رُوحانی باپ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کا یہی ذہن روحانی تصرف کے ذریعے جب مجھے منتقل ہوا تو کتاب کی ترتیب و تالیف کا کام شروع ہو گیا۔ مرشد کریم کے تصرف، اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر رحمت سے کتاب پوری ہوئی جو آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ تحریر آسان ہو اور طوالت قاری کے اوپر گراں نہ گزرے۔ زیر نظر کتاب میں اجمال اور تفصیل کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ حضرت بابا تاج الدین ناگپوری رح کی ہستی سے متعلق زیادہ سے زیادہ گوشے دائرہ تحریر میں آجائیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت بابا تاج الدین ناگپوری جیسی ہمہ صفت، عظیم المرتبت اور عارف ذات ذجل جلالہٗ ہستی پر کچھ لکھنا اور اس کا حق ادا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی جو کچھ مجھے جہاں

سے بھی ملا، میں نے کم سے کم صفحات پر اسے بکھیر دیا ہے۔

حضرت بابا تاج الدین ناگپوری کے حالات اور کشف وکرامات کی تالیف و تدوین میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان میں جناب۔ قطب الدین کی کتاب "تاج قطبی"، حضرت فرید الدین المعروف کریم بابا تاجی کی تالیف "تاج مُراری" اور بابا ذہین شاہ تاجی کی کتاب "تاج الاولیاء" شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ماہنامہ رُوحانی ڈائجسٹ کراچی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ میں روحانی ڈائجسٹ کے ایڈیٹر جناب حکیم وقار یوسف عظیمی کا ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تالیف و تدوین میں ہر ممکن تعاون کیا۔ اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے، آمین!

سہیل احمد عظیمی

۲۔ ذی قعد ۱۴۰۵ھ

مطابق

۲۱۔ جولائی ۱۹۸۵ء

حضرت بابا تاج الدین اولیاءؒ

رُوحانی انسان

کائنات میں رنگ رنگ عجائبات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں دو رُخ نظر آتے ہیں۔ ایک رُخ انکار، شکوک و شبہات پر قائم ہے اور دوسرا رُخ یقین اور سچائی پر قائم ہے۔ کائنات میں انکار اور اقرار کے یہ دونوں رنگ ہر لمحہ اور ہر آن متحرک رہتے ہیں۔ یقین اور اقرار کا تذکرہ سچائی اور راست بازی سے کیا جاتا ہے جس طرح انکار کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح سچائی اور راست بازی کا تذکرہ بھی ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ عام طور پر اس لفظ کی معنویت اور طاقت پر بہت کم غور کیا جاتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی یہ لفظ زبان پر آتا ہے کہنے والا اپنے اندر لامحدود طاقت کے چشمے اُبلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ کائنات کی ساری طاقتیں اسی لفظ میں پوشیدہ ہیں اور راست بازی قدرت کا دوسرا نام ہے۔ ہم جس چیز کو غیب کے نام سے جانتے ہیں وہ بھی دراصل راست بازی کی چھپی ہوئی طاقتوں کا ایک مربوط نظام ہے۔ نبی اور رسولوں کے ذریعے دنیا میں جتنے بھی غیر معمولی مذاہب رونما ہوئے ان سب نے راست بازی کے خدوخال میں نشو و نما پائی۔ نبی اور رسولوں کی بعثت کا سلسلہ جب ختم ہو گیا تو اللہ تعالےٰ کی سنّت کے مطابق، انبیاء کے شاگردوں کو انبیاء کی طرزِ فکر منتقل ہوتی رہی۔ لوگ پیدا ہوتے رہے اور انبیائے کرام کے علوم ان پاکیزہ نفس حضرات کو منتقل

ان ہی پاکیزہ، باکردار اور مقدس و مطہر حضرات میں علم و عرفان سے آراستہ ایک ہستی حضرت بابا تاج الدین ناگ پوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

جس طرح روشنی کے ظہور کے لئے میڈیم (بلب) کا ہونا ضروری ہے اسی طرح قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ خود کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں منعکس کرنے کے لئے اپنا ایک میڈیم بناتی ہے اور یہ میڈیم خود قدرت کا اپنا عکس بن جاتا ہے۔ اس میڈیم کا عمل قدرت کا عمل ہوتا ہے۔ قدرت جو کچھ کہنا چاہتی ہے اس کا مفہوم اس کی گفتار میں چھپا ہوتا ہے۔ قدرت جو کچھ دکھانا چاہتی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں میں عکس ریز رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی کے ایک ایک لمحے پر قدرت کے سربستہ راز محیط ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ پاکیزہ حضرات اعلیٰ ترین انسانی صلاحیتوں سے متصف ہوتے ہیں۔

حضرت بابا تاج الدینؒ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے دماغ پسِ پردہ عمل میں آنے والے مناظر کو براہِ راست دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن خیال اور تصور میں بھی مشیت کے اشارے تلاش کرتا ہے۔ ایسے حضرات کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں کام کرتی ہیں۔ اتنی غیر معمولی صلاحیتیں کہ جو چیزیں سامنے نہیں ہوتیں وہ ان کو بھی سامنے سے آتی ہیں۔ ان کے ذہن کے ساتھ کائنات کی ہر شے حرکت کرتی ہے۔ قدرت [illegible] کو متعارف کرانے کے لئے ایسے حضرات پیدا کرتی ہے جو قدرت کے امین ہوتے ہیں۔ قدرت کا یہی جذبہ بابا تاج الدین جیسی ہستی کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح کوئلہ ایک پتھر ہے اور ہیرا بھی پتھروں کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح ہم انسانوں کی دنیا میں بابا تاج الدینؒ بھی ایک ہیرا تھے جسے مشیتِ ایزدی نے

ہوتے رہے۔ عرفِ عام میں ان ہی باحوصلہ، باعزم، باہمت اور راست باز لوگوں کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ دراصل شکل و صورت میں، فکر و نظر میں اور حیات و ممات میں راست بازی کے نقوش ہیں۔ سچائی اور راست بازی ان شخصیتوں میں رواں دواں رہتی ہے۔ ان کی پیشانیوں پر ضو فشاں رہتی ہے۔ ان کی نورانی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی بصیرت اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ راست بازی کے پیغامات ہوتے ہیں۔ اور یہی نوعِ انسان کا حقیقی سرمایہ ہیں۔

ماضی ہو، دورِ حاضر کی مادی ترقیاں ہوں یا مستقبل میں زمین و آسمان کو ایک بنا دینے والی ایجادات ہوں بہرکیف عارضی اور فنا ہو جانے والی ہیں لیکن اہلِ زمین کے لئے راست بازی ایک ایسا سرمایہ ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ اس لامتناہی اور ہمیشہ قائم رہنے والے سرمائے کا نام حقیقی دنیا میں روحانیت ہے۔ جن شخصیتوں اور نُفوسِ قدسیہ حضرات کو یہ سرمایہ حاصل ہے وہ انسانی زندگی کا جوہر ہیں۔ ان کے فیض سے انسانی چہروں میں سادگی و پاکیزگی، انسانی قد و قامت میں صبر و عزم، انسانی قلب میں نور اور روشنی کی تحریکات ملتی ہیں۔ یہ روشن اور منور لوگ اندھیروں اور اجالوں کے درمیان حدِ فاصل ہیں۔ ترقی اور تہذیب کے نت نئے شگوفے انسانیت کے ماتھے پر جھومر نہیں بن سکے لیکن ان پاکیزہ خیالات لوگوں نے ہمیشہ نوعِ انسانی کو سکون و راحت کی دولت سے نوازا ہے۔ آج بھی یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجسم پیغام ہیں۔ ان کی پیشانیوں سے وہ شعاعیں نکلتی ہیں جن شعاعوں کے ذریعے فرش والے عرش پر متمکن ہو جاتے ہیں اور اللہ کی آواز صوتِ سرمدی بن کر ان کے کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔ نگاہ اوپر اٹھتی ہے تو تجلیات کا ہجوم ان کا استقبال کرتا ہے۔

تراش خراش کے مراحل سے گزار کر رنگ و نور کا مجموعہ بنا دیا تھا۔

اولیاء اللہ اور عارف باللہ حضرات کی تاریخ میں بابا صاحب کی ذات ایک پورا باب ہے، ایسا باب جس کو پوری طرح سمجھنا ہم جیسے لوگوں کے لئے تو کجا بڑے بڑے لوگوں کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی جو کچھ بابا صاحب سے متعلق ہم تک پہنچا ہے اس کے ذریعے ہم اپنے ذہنوں میں بابا صاحب کی ہستی کا ایک خاکہ ضرور بنا سکتے ہیں اسی طرح جس طرح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو روشنی رات کے سیاہ اندھیرے کو چاک کر دیتی ہے، اسے دیکھ کر سورج کی موجودگی اور اس کی عظمت کا تصور ہمارے ذہنوں پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اہلِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ بابا صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی ساڑھے تین ہزار سال میں پیدا ہوتی ہے۔

بابا تاج الدین کا تذکرہ کوئی قصۂ پارینہ نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے بابا صاحبؒ کو دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں، ان کے انداز و اطوار کا مشاہدہ کیا ہے۔ ماضی قریب میں بہت سے لوگ ہم سے جدا ہو گئے جن کی آنکھیں بابا صاحب کی شانِ جلال و جمال کی امین تھیں۔ ان لوگوں میں عام طبقے سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہایت قابل اور مقتدر افراد شامل ہیں۔ ان حضرات نے جب بھی بابا صاحب کا ذکر کیا یا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بدل جاتا ہے، اندازِ بیان میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ احترام، عقیدت اور اعترافِ عظمت ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکنے لگتا ہے۔

بابا تاج الدین نہ کوئی حاکم تھے، نہ آپ کے پاس دولت کی قوت تھی، نہ ہی مذہبی اقتدار حاصل تھا۔ پھر بھی نہ جانے کون سی حکمت اور خوبی انہیں حاصل تھی کہ حکمرانوں

نوابوں اور رؤسا کی پیشانیاں اس فقیر کے دربار میں جھک جھک گئیں۔ ۳۵ سال تک لوگ قطار در قطار کھنچے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ بابا صاحب کا یہ بہت بڑا اعجاز ہے کہ مسلسل ۳۵ سال عوام میں رہ کر ان کی حاجت روائی فرمائی۔ اپنی توانائی، ذہن اور وقت کا ایثار کر کے لوگوں کے لئے سامانِ تسکین فراہم کیا۔ لوگ حاضرِ خدمت ہوتے تو سب دکھ بھول جاتے اور یوں لگتا جیسے خوشی اور اطمینان ان کے خون کے ساتھ دوڑنے لگا ہے۔ لوگ وہ مسرتیں حاصل کرتے جو دنیا کے سارے وسائل فراہم ہونے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ سادگی اور خلوص کے اندرونی چشمے یک دم ابل پڑتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ساری آلائشیں دھل گئی ہیں۔ اور دماغ پاکیزگی اور لطافت سے معمور ہو گیا ہے۔

بابا صاحب کی زبانِ مبارک حق کی آواز تھی۔ ان کی جامع صفات ہستی پر حدیثِ قدسی کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔

"اے میرے بندے! میری اطاعت کر، میں تجھے اللہ والا بنا دوں گا۔
پھر تو جس چیز کو کہے گا ہو جا، وہ ہو جائے گی۔"

آج ناگ پور کی وجہِ تعارف بابا تاج الدین ہیں۔ ناگ پور کا نام آتے ہی بابا صاحب کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔ صرف ناگ پور ہی میں نہیں، ہر جگہ بابا صاحب کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ آج بھی لاکھوں دلوں پر بابا صاحب کی حکومت قائم ہے۔ بابا کے نام کے ساتھ لاکھوں دلوں میں عقیدت و محبت کے بے لوث جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں گھروں میں بابا صاحب کی آویزاں تصاویر اس تعلقِ خاطر کی گواہ ہیں۔ آج بھی بابا تاج الدین کا نام پردۂ سماعت سے ٹکراتا ہے یا نگاہ ان کی تصویر پر پڑتی

ہے تو لگتا ہے کہ بابا صاحب اپنی شانِ ولایت سے جلوہ افروز ہیں۔ بے شک ایسے قدسی نفس حضرات کو موت فنا نہیں کر سکتی۔ وہ امر ہیں۔ زندگی ان کی آغوش میں کروٹیں لے رہی ہے لیکن ہمیں شعور نہیں ہے۔

*

حالاتِ زندگی

نام اور القاب

آپ کا نام محمد تاج الدین تھا۔ اور پیار سے چراغ دین کہلاتے تھے۔ عرفِ عام میں تاج الدین بابا کہلائے۔ آپ کے القاب یہ ہیں :-

تاج الاولیاء ،

تاج الملت والدین ،

تاج العارفین ،

تاج الملوک ،

سراج السالکین ،

شہنشاہ ہفت اقلیم۔

شہنشاہ ہفت اقلیم بابا صاحب کا ایسا لقب ہے جو تشریح و توضیح طلب ہے۔ اس کی مختصر تشریح یوں ہے کہ تمام عالم کو اللہ تعالیٰ کے نظامِ تکوین میں سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو سات (ہفت) اقلیم کہلاتے ہیں۔ چنانچہ باعثِ تکوینِ کائنات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نائب جس کے انتظام و اختیار میں ساتوں اقلیم ہوتے ہیں، شہنشاہِ ہفت اقلیم کہلاتا ہے۔

خاندان

باباتاج الدین اولیاءؒ کا سلسلۂ نسب امام حسن عسکری سے ملتا ہے۔ امام حسن عسکری کی اولاد میں فضیل مہدی عبداللہ عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقے مدراس میں قیام کیا۔ حضرت فضیل مہدی عبداللہ کے دو صاحبزادے حسن مہدی جلال الدین اور حسن مہدی رکن الدین سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ باباتاج الدین حسن مہدی جلال الدین کی اولاد میں سے ہیں۔

باباصاحب کے بزرگوں میں جناب سعدالدین مہدی مغلیہ دور میں فوجی افسر ہوکر دہلی آئے۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے اہارنام کا ایک موضع بطور جاگیر انہیں دیا گیا۔ فسترخ سیر کے دور میں صوبے کے گورنر نواب مالاگڑھ نے ناراض ہوکر حقوق جاگیرداری ضبط کر لئے۔ صرف کاشتکاری کی حیثیت باقی رہ گئی۔

باباتاج الدین کے دادا کا نام جمال الدین تھا۔ باباصاحب کے والد جناب بدرالدین مہدی تھے جو ساگر ڈپو میں صوبے دار تھے۔ اور ان کی سکونت اہار میں تھی۔ ساگر ہندوستان کے صوبے سی۔پی میں واقع ہے۔ باباصاحب کی والدہ کا نام مریم بی تھا۔

پیدائش

حسن مہدی بدرالدین کی اہلیہ مریم بی صاحبہ نے ایک نہایت تاثرانگیز خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاند آسمان پر پوری آب وتاب سے چمک رہا ہے اور ساری فضا چاندنی سے معمور ہے۔ یکایک چاند آسمان سے گیند کی طرح لڑھک کر ان کی گود میں آگرا۔ اور کائنات اس کی روشنی سے منور ہوگئی۔ اس خواب کی تعبیر باباتاج الدینؒ کی پیدائش کی صورت میں سامنے آئی۔

عام روایت کے مطابق باباتاج الدین اولیاءؒ ۵۔ رجب المرجب ۱۲۷۷ھ

مطابق ۲۷۔جنوری ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش پیر کے دن فجر کے وقت بمقام کامٹی، ناگ پور ہوئی۔ قلندر بابا اولیاءؒ (نواسہ باباتاج الدینؒ) نے کتاب "تذکرہ تاج الدین بابا" میں لکھا ہے:۔

"تحقیق وتلاش کے بعد بھی ناناتاج الدین کا سالِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکا۔ بڑے نانا (باباتاج الدین کے بھائی) کی حیات میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا۔ والد صاحب کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے بڑے نانا کی زبانی سُنا ہے کہ تاج الدین کی عمر غدر میں (یعنی ۱۸۵۷ء میں)، چند سال تھی۔"

ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھا جائے تو بھی باباصاحب کے سنِ پیدائش میں چند سال کا فرق پڑتا ہے۔

عام بچوں کے برعکس باباصاحب پیدائش کے وقت روئے نہیں بلکہ آپ کی آنکھیں بند تھیں اور جسم ساکت تھا۔ یہ دیکھ کر وہاں موجود خواتین کو شبہ ہوا کہ شاید بچہ مردہ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ قدیم قاعدے کے مطابق کسی چیز کو گرم کر کے پیشانی اور تلووں کو داغا گیا۔ باباصاحب نے آنکھیں کھولیں، روئے اور پھر خاموش ہوکر چاروں طرف ٹک ٹک دیکھنے لگے۔

بچپن اور جوانی

باباتاج الدینؒ کی عمر ابھی ایک برس تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور جب آپ نو سال کے ہوئے تو والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ والدین کے انتقال کے بعد نانا، نانی اور ماموں نے باباصاحب کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

چھ سال کی عمر میں باباصاحب کو مکتب میں داخل کر دیا گیا تھا۔ ایک دن مکتب میں

بیٹھے درس سن رہے تھے کہ اُس زمانے کے ایک ولی اللہ حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ مدرسے میں آئے اور استاد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ لڑکا پڑھا پڑھایا ہے، اسے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لڑکپن میں بابا تاج الدینؒ کو پڑھنے کے علاوہ کوئی شوق نہ تھا۔ آپ کھیل کود کے بجائے تنہائی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ پندرہ سال کی عمر تک آپ نے ناظرہ قرآن پاک، اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی۔

فوج میں شمولیت

ایک مرتبہ ناگپور کی کنہان ندی میں شدید طغیانی آگئی اور سیلاب میں بابا صاحب کے سرپرستوں کا سارا سامان بہ گیا۔ بے سروسامانی بابا صاحب کی ملازمت کا فوری سبب بنی۔ بابا صاحب نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ اور ناگپور کی رجمنٹ نمبر ۸ (مدراسی پلٹن) میں شامل کرلئے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔

کچھ عرصہ بعد بابا صاحب کی رجمنٹ کا تقرر ساگر میں کر دیا گیا۔ بابا تاج الدینؒ کے نواسے قلندر بابا اولیاءؒ لکھتے ہیں:

نانا تاج الدین فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ساگر ڈپو میں تعینات کئے گئے تھے۔ رات کے ۹ بجے گنتی سے فارغ ہو کر بابا داؤد مکی کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ وہاں صبح تک مراقبہ اور مشاہدہ میں مصروف رہتے اور صبح سویرے پریڈ کے وقت ڈپو میں پہنچ جاتے۔ یہ شغلہ پورے دو سال تک جاری رہا۔ دو سال بعد بھی ہفتہ میں ایک دو بار ان کے یہاں حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ جب تک ساگر میں رہے اس معمول میں فرق نہیں آیا۔

کامٹی میں بابا تاج الدین کی نانی کو جب اس بات کی خبر ملی کہ نواسہ راتوں کو غائب رہتا ہے تو خیال آیا کہ شاید آپ بری صحبتوں کا شکار ہو کر بے راہ رَو ہو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر نانی صاحبہ ساگر جا کر ٹھہر گئیں تاکہ یہ معلوم کریں کہ نواسہ راتوں کو کہاں رہتا ہے۔ نانی نے اس خبر کو سچ پایا کہ نواسہ رات کو کہیں جاتا ہے۔ ایک رات کہیں باہر رہ کر صبح بابا صاحب گھر آئے تو نانی نے ناشتہ سامنے رکھا۔ بابا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ اس جواب سے نانی مزید فکرمند ہوئیں اور پکا ارادہ کر لیا کہ رات کو نواسے کا تعاقب کر کے دیکھیں گی کہ وہ کہاں جاتا ہے۔

رات کو جب بابا صاحب ویرانے کی طرف روانہ ہوئے، نانی بھی نظر بچا کر چپکے چپکے پیچھے ہو لیں۔ دیکھا کہ نواسہ ایک مزار کے اندر داخل ہوا۔ چند سے انتظار کے بعد اندر جا کر دیکھا تو بابا صاحب ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ نواسے کو عبادت و ریاضت میں حد درجہ مستغرق دیکھ کر نانی صاحبہ کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ انہوں نے بابا صاحب کو بہت دعائیں دیں اور خاموشی سے واپس چلی آئیں۔

بابا صاحب صبح کو نانی کے پاس آئے تو ان کے ہاتھوں میں چھوٹے پتھر تھے۔ نانی صاحبہ نے ناشتہ پیش کیا تو بابا صاحب نے پتھر دکھاتے ہوئے کہا۔

"نانی! میں تو یہ لڈو پیڑے کھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر بابا صاحب نے پتھروں کو یوں کھانا شروع کیا جیسے کوئی مٹھائی کھاتا ہے۔ نواسے کی یہ کیفیت دیکھ کر نانی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دو نوکریاں نہیں کرتے

رفتہ رفتہ بابا تاج الدین کی طبیعت میں استغراق پیدا ہونے لگا۔ ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے بابا صاحب

زندگی کے ... دور کی بنیاد ڈالی۔ باباصاحب کی ڈیوٹی اسلحے کے ذخیرے پر لگائی گئی تھی۔ ایک رات دو بجے جب باباصاحب اسلحے کے ذخیرے پر پہرہ دے رہے تھے، انگریز کیپٹن اچانک معائنے کے لئے آگیا۔ باباصاحب کو سنتری سے پہرہ دیتے دیکھ کر واپس ہوا تو نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس سے گزرا۔ مسجد کا صحن چاندنی رات میں صاف نظر آرہا تھا۔ کیپٹن نے دیکھا کہ وہ جس سپاہی کو پہرہ دیتے دیکھ کر آیا ہے وہ خشوع و خضوع کے ساتھ صحن مسجد میں نماز ادا کر رہا ہے۔ سپاہی کو ڈیوٹی سے غفلت برتتے دیکھ کر اسے سخت غصہ آیا۔ وہ اسلحہ خانے واپس آیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر سپاہی پکارا "ہالٹ" کیپٹن آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سپاہی (باباصاحب) اپنی جگہ پر موجود ہے۔ کچھ کہے بغیر اس نے مسجد کا رخ کیا جہاں وہ سپاہی کو نماز میں مشغول دیکھ چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ باباصاحب اسی طرح محویت کے عالم میں مصروف عبادت ہیں۔ وہ ایک بار پھر تصدیق کے لئے اسلحہ خانے پہنچا تو باباصاحب کو ڈیوٹی پر موجود پایا۔ دوسری بار مسجد جاکر دیکھا تو وہی منظر سامنے تھا۔

دوسرے روز اس نے اپنے بڑے افسر کے سامنے باباصاحبؒ کو طلب کرکے کہا۔ ہم نے تم کو رات دو دو جگہ دیکھا ہے۔ ہم سمجھتا ہے کہ تم خدا کا کوئی خاص بندہ ہے۔" یہ سننا تھا کہ باباتاج الدینؒ کو جلال آگیا۔ سرکاری وردی اور دوسرا سامان کیپٹن کے سامنے لاکر رکھا اور اپنے مخصوص مدراسی لہجے میں فرمایا۔

"لو جی حضرت! اب دو دو نوکریاں نہیں کرتے جی حضرت!"

یہ کہہ کر باباصاحب جذب و جلال میں فوجی احاطے سے باہر نکل آئے۔ کامٹی میں رشتہ داروں کو یہ اطلاع دی گئی کہ باباصاحب پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے اور انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ نانی بے تاب ہوکر ساگر آئیں اور دیکھا کہ نواسے پر بے خودی طاری ہے۔ وہ باباصاحب کو کامٹی لے گئیں اور دماغی مریض سمجھ کر ان کا علاج شروع کیا۔ لیکن کوئی مرض ہوتا تو علاج کارگر ہوتا۔ چار سال تک باباتاج الدینؒ پر جذب و استغراق کا شدید غلبہ رہا۔ لوگ ان کو مخبوط الحواس سمجھ کر چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مجذوبانہ کیفیات میں ہوش کے اشارے اور ولایت کا رنگ دیکھ کر باباصاحب کا احترام کرتے تھے۔

نسبتِ فیضان

اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ باباتاج الدینؒ نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ معتبر ذرائع بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس عالمِ رنگ و بو میں آپ کا پیر و مرشد کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی دو ہستیاں ایسی ہیں جن سے صرف قربت اور نسبت ثابت ہے۔ ایک سلسلۂ قادریہ کے حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ، دوسرے سلسلۂ چشتیہ کے بابا داؤد مکیؒ۔

حضرت عبداللہ شاہ صاحبؒ وہی بزرگ ہیں جو باباصاحب کے زمانۂ تعلیم میں مکتب آئے تھے اور استاد کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ یہ لڑکا (باباتاج الدین) پڑھا پڑھایا ہے، اسے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ کا مزار کامٹی اسٹیشن کے پاس ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں باباتاج الدینؒ حضرت عبداللہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ شاہ کے سجادہ نشین کی روایت کے مطابق جب حضرت عبداللہ شاہ صاحبؒ کے وصال کا وقت قریب آیا تو باباتاج الدینؒ ان کے پاس آئے۔ اس وقت شربت بناکر شاہ صاحب کو پیش کیا گیا۔ انہوں

چند گھونٹ پی کر باقی بابا صاحب کو پلادیا۔

بابا داؤد مکیؒ خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے خلیفہ تھے اور خواجہ شمس الدین ترکؒ کو مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ سے خلافت ملی تھی۔ بابا داؤد مکیؒ مرشد کے حکم پر ساگر آئے اور یہیں وصال فرمایا۔ ان کا بظاہر کوئی خلیفہ نہیں تھا۔ بابا داؤدؒ کے وصال کے کوئی چار سو سال بعد جب بابا تاج الدینؒ فوجی ملازمت کے سلسلے میں ساگر گئے تو آپ نے بابا داؤد مکیؒ کے مزار پر تقریباً دو سال ریاضت و مراقبے میں گزارے۔ روایت کے مطابق یہیں بابا صاحبؒ کو چشتیہ نسبت اویسیہ طریقے پر منتقل ہوئی۔ اویسیہ نسبت وہ نسبت یا رابطہ ہے جس کے تحت سالک کو کسی بزرگ کی روح سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایسا فیض جو مرشد کے جسمانی طور پر سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے منتقل ہو۔ یہ وہی نسبت ہے جس کے تحت حضرت اویس قرنیؓ کو سرکارِ دو عالم حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے علوم اور فیوض حاصل ہوئے تھے۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے تھے کہ بابا تاج الدینؒ کو حضرت عبداللہ شاہؒ کی قربت حاصل ہوئی تھی اور نسبت چشتیہ بابا داؤد مکیؒ کے مزار پر منتقل ہوئی تھی۔ لیکن بابا صاحب کی تعلیم و تربیت خود جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت اویس قرنیؓ نے کی ہے۔ نیز بابا صاحب کو ہر سلسلے کے اکابر اولیاء اللہ کی ارواح سے فیض حاصل ہوا ہے۔ بابا تاج الدینؒ کے کئی ارشادات میں اویسیہ فیضان کی طرف اشارہ موجود ہے۔

بابا صاحب اپنی ولایت کے رنگ اور نسبت کو اکثر یہ کہہ کر بھی ظاہر کرتے تھے کہ ——— ہمارا نام تاج محی الدین، تاج معین الدین ہے۔

شجرہ چشتیہ

حضرت سرور کائنات محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علیؓ

حضرت حسن بصریؒ

حضرت عبدالواحد زیدؒ

حضرت فضیل بن عیاضؒ

حضرت ابراہیم ادہمؒ

حضرت خواجہ سدید الدین حذیفہ مرعشیؒ

حضرت ہبیرۃ البصریؒ

حضرت ممشاد دینوریؒ

حضرت ابو اسحاق شامیؒ

حضرت ابو احمد ابدالؒ

حضرت ابو محمد ابدالؒ

حضرت ناصر الدین ابو یوسفؒ

حضرت قطب الدین مودود چشتیؒ

حضرت حاجی شریف زندنیؒ

حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ

حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیریؒ

حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ

حضرت بابا داؤد مکیؒ

بطریق اویسیہ

حضرت بابا تاج الدین اولیاءؒ

شجرہ قادریہ

حضور سرور کائنات محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علیؓ

حضرت امام حسینؓ

حضرت امام زین العابدینؓ

حضرت امام محمد باقرؒ

حضرت امام جعفر صادقؒ

حضرت امام موسیٰ کاظمؒ

حضرت امام علی رضاؒ

حضرت معروف کرخیؒ

حضرت شیخ مسکین الدینؒ

حضرت ابوالحسن سری سقطیؒ

حضرت جنید بغدادیؒ

حضرت ابوبکر شبلیؒ

حضرت عبدالواحد بن عبدالعزیزؒ

حضرت ابوالفرح یوسف طرطوسیؒ

حضرت ابی الحسن علی ہنکاریؒ

حضرت ابوسعید مبارک مخزمیؒ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت عبدالعزیزؒ

حضرت سید محمد الہتاکؒ

حضرت سید شمس الدینؒ

حضرت سید شرف الدینؒ

حضرت سید زین الدینؒ

حضرت سید ولی الدینؒ

حضرت سید نور الدینؒ

حضرت سید حسام الدینؒ

حضرت سید فرید الدینؒ

حضرت سید محمود درویشؒ

حضرت سید قادریؒ

حضرت عبدالجلیلؒ

حضرت سید عبداللہ شاہؒ

●

حضرت بابا تاج الدین اولیاءؒ

● حضرت سید عبداللہ شاہؒ نے بابا تاج الدینؒ کو [illegible] کھجور کھلائی تھی اور اپنے وصال کے وقت شربت پلایا تھا۔

بابا صاحب کبھی یہ بھی فرماتے:

ہمارا نام تاج الاولیاء، تاج الملّت والدین، شہنشاہ ہفت اقلیم، سیّد محمد بابا تاج الدین ہے۔

پاگل جھونپڑی

فوج کی ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد بابا تاج الدینؒ کامٹی میں رہنے لگے تھے۔ اس زمانے میں جذب و بیخودی عروج پر تھی۔ لوگ آپ کے استغراق کو پاگل پن سے تعبیر کرتے لیکن کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بنا پر لوگوں میں آپ کی شخصیت ایک صاحبِ کرامت اور صاحبِ فیض کی حیثیت سے اُبھرنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پریشان حالوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کے گرد رہنے لگا۔ لوگ ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے اور اپنی مشکلات بیان کرتے۔ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ رات دن ایک ہو گیا۔ ایک روز بابا تاج الدین نے فرمایا۔

"لوگ ہمیں بہت ستاتے ہیں۔ اب ہم پاگل جھونپڑی چلے جائیں گے۔"

چنانچہ خود بخود ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ آپ کو ناگ پور کے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔ تاریخ داخلہ ۲۶۔ اگست ۱۸۹۲ء تھی۔

بابا صاحبؒ نے اس پاگل خانے کو ولی خانے میں تبدیل کر دیا۔ اور جلد ہی پاگل خانے کے منتظمین اور ڈاکٹر سمجھ گئے کہ پاگل خانے میں وارد ہونے والی یہ ہستی مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر عبدالمجید اور ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ آپ کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کے بستر کی صفائی اور خورد و نوش کا انتظام بذاتِ خود کرتے تھے۔

پاگل خانے کے قیام کے زمانے میں بابا تاج الدینؒ پر جذب و استغراق کا غلبہ کم ہو گیا۔ اور آپ اکثر شعوری حالت میں رہنے لگے۔ شعوری حالت میں بھی اُن سے اس تواتر اور تسلسل سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا کہ گویا وہ ان کے نزدیک خرقِ عادت نہیں بلکہ معمول ہے۔

ایک شام مقررہ وقت پر بابا تاج الدینؒ کو ان کے کمرے میں پہنچا کر کمرہ مقفل کر دیا گیا۔ اور پاگل خانے کا صدر دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ اگلی صبح محافظ نے صدر دروازہ کھولا تو بابا تاج الدینؒ باہر سے اندر آنے کے منتظر کھڑے تھے۔ محافظ بابا صاحبؒ کو باہر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ فوراً منتظمین اور ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ وہ لوگ فوراً آئے اور بابا تاج الدینؒ کو ساتھ لے کر ان کے کمرے کے پاس پہنچے۔ کمرے کا دروازہ ہنوز مقفل تھا۔ وہ لوگ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ بابا تاج الدینؒ ایک عام آدمی نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اس وقت کچھ نہیں کہا۔ لیکن ان کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس غیر معمولی واقعے کا چرچا پورے ناگ پور میں عام ہو گیا۔ پھر تو لوگ جوق در جوق زیارت کے لئے حاضر ہونے لگے۔

اس کے بعد بابا صاحبؒ اکثر صبح کے وقت باہر سے تشریف لاتے اور اپنے کمرے کے پیچھے لان پر پڑی ہوئی کرسیوں اور بنچوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتے۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے مسائل کا حل چاہتے۔ بابا صاحب ان کے مسائل کا حل بتاتے۔

پاگل خانے میں بابا صاحب کی خدمت میں عوام و خواص کی آمد و رفت اتنی روز افزوں تھی کہ حکومت نے ملاقاتی فیس مقرر کر دی۔ کچھ دنوں بعد یہ ملاقاتی فیس ختم

کردی گئی۔ بابا صاحبؒ کے دربار میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، حاکم محکوم سب
حاضری دیتے تھے۔ ان میں سر انتونی میکڈونلڈ چیف کمشنر سی پی و برار، سول سرجن کرنل رُو،
ایس پی پولیس موتی، ایڈیشنل اسسٹنٹ کمشنر خان بہادر ولایت اللہ خاں وغیرہ کے نام
قابل ذکر ہیں۔

اُس زمانے میں شکرورا، واکی اور بہت سے علاقے مرہٹہ راجا رگھوجی راؤ کی ملکیت
تھے۔ اس کا عالی شان محل اور اس سے متصل کئی میل لمبا باغ شکرورا میں تھا۔ راجا رگھوراؤ
کے بیٹے وناؔیک راؤ کی رانی حاملہ تھی۔ وضع حمل کا وقت قریب آیا لیکن پیدائش عمل
میں نہیں آئی۔ موقع پر موجود سرجن اور لیڈی ڈاکٹروں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کامیابی
نہیں ہوئی۔ رانی تکلیف سے بے ہوش ہوگئی اور شام تک اس کی حالت میں کوئی امید افزا
تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی۔ شام کو ڈاکٹروں نے مشورہ کیا اور متفقہ فیصلہ دے دیا کہ بچے کی
موت واقع ہو چکی ہے اور اگر آپریشن کے ذریعے بچے کو باہر نہ نکالا گیا تو رانی کی موت
واقع ہو جائے گی۔

راجہ رگھوجی راؤ ڈاکٹروں کے اس فیصلے سے تذبذب میں پڑ گئے اور ان کے
ذہن نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ صبح چھ بجے راجا رگھوجی پوجا سے فارغ ہوئے
تھے کہ ان کا موٹر ڈرائیور حاضر خدمت ہوا اور اس نے کہا۔

"حضور! میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل کیجئے۔ آپ میرے ساتھ پاگل خانے چلیے
وہاں ایک بہت بڑے ولی اللہ تشریف فرما ہیں۔ سب لوگ ان سے فیض اٹھا رہے
ہیں۔ آپ بھی چھوٹی رانی کے سلسلے میں ان کی خدمت میں عرض کیجئے۔"

راجا رگھوجی راؤ اسی وقت اٹھے اور ننگے پیر موٹر میں سوار ہو گئے۔ اور ڈرائیور ممکنہ

تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا پاگل خانے کے صدر دروازے پر جا رکا۔ پاگل
خانے کے منتظمین اور سپرنٹنڈنٹ کو راجہ صاحب کی آمد کا علم ہوا تو وہ فوراً بھاگے
ہوئے استقبال کو آئے۔ ڈرائیور نے راجہ صاحب کو وہیں موٹر کے پاس رُکنے کو کہا اور
خود لان میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا۔

"حضور! شکرورا اسٹیٹ کے راجا رگھوجی راؤ حاضر خدمت ہونے کی اجازت
اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

بابا صاحب نے فرمایا "ہم فقیر جی حضرت، ہمارے سے راجہ کا کیا کام جی حضرت۔"
ڈرائیور نے بہت منت سماجت کی تو بابا صاحبؒ خاموش ہو گئے۔ خاموشی کو اجازت
سمجھ کر وہ دوڑا ہوا راجہ رگھوجی راؤ کے پاس پہنچا اور کہا۔

"فوراً چلئے اور حضور بابا صاحبؒ کے قدم پکڑ لیجئے۔"

راجہ جلدی سے اندر پہنچا اور بابا صاحبؒ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ بابا
صاحبؒ نے اس کو ایک نظر دیکھ کر فرمایا۔

"اُدھر کیا کرتے جی حضرت! اُدھر جانا، لڑکا پیدا ہوا تو خوشیاں منانا۔"

ڈرائیور حضور بابا صاحبؒ کا بہت معتقد تھا۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر
ہوتا تھا۔ وہ بابا صاحبؒ کے مخصوص لب و لہجہ سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے راجہ
سے کہا۔

"راجہ صاحب! بس کام ہو گیا۔ واپس چلئے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے گھڑی دیکھ کر وہ وقت نوٹ کر لیا جس وقت بابا صاحبؒ
نے متذکرہ بالا جملے ادا کئے تھے۔

واپسی میں راجہ رگھوجی راؤ کی موٹر محل کے صدر دروازے کے قریب پہنچی تو انہیں شہنائیوں اور نفیریوں کی آواز سنائی دی۔ آنے جانے والے ملازمین کے چہروں پر خوشی کے آثار نظر آرہے تھے اور وہ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ موٹر کے رکتے ہی سب لوگوں نے راجہ کی موٹر کو گھیر لیا اور کنور صاحب کی پیدائش کی خوشخبری سنائی۔

راجہ یہ خبر سنکر خوشی سے بے خود ہوگیا۔ اور حکم دیا کہ خزانے کا منہ کھول دیا جائے۔ ڈرائیور نے راجہ سے کہا۔

"سرکار! پنڈتوں سے جو کنور صاحب کی جنم پتری اور جنم کنڈلی بنائیں گے اور ڈاکٹروں سے پیدائش کا صحیح وقت معلوم کرا دیجئے۔"

پنڈتوں اور ڈاکٹروں نے جو وقت بتایا وہ بالکل وہی تھا جس وقت حضور بابا صاحب نے فرمایا تھا" ادھر کیا کرتے جی حضرت! ادھر جانا، لڑکا پیدا ہوا تو خوشیاں منانا۔

شکر درہ میں قیام

بابا تاج الدینؒ کی کرامت دیکھ کر راجہ رگھوجی راؤ ان کا گرویدہ ہوگیا۔ اور بابا صاحبؒ کی محبت و عقیدت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ چیف کمشنر ناگ پور کی وساطت سے ضمانت دے کر ستمبر ۱۹۰۸ء میں بابا صاحبؒ کو پاگل خانے سے شکردرہ اپنے محل میں لے آیا۔ راجہ بابا صاحب کو ایک جلوس کی شکل میں اپنے محل لے گیا۔ جلوس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے۔ راجہ رگھوجی بابا صاحبؒ کو ساتھ لے کر ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے آگے سجے سجائے گھوڑوں اور اونٹوں کی قطاریں تھیں اور جلوس کے آگے آگے شاہی

بینڈ نغمہ سرائی کرتا ہوا چل رہا تھا۔ راستے کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم موجود تھا اور لوگ اپنی محبت اور شیفتگی کے مظاہرے میں پھول نچھاور کر رہے تھے۔

راجہ رگھوجی راؤ نے اپنے محل کا بیرونی بڑا حصہ حضور بابا صاحبؒ کے قیام کے لئے مخصوص کردیا اور اب فیض کا چشمہ پاگل خانے کی بجائے شکردرا کے محل سے جاری ہوگیا۔ دن رات حضور بابا صاحبؒ کے اطراف لوگ موجود رہتے۔ بابا صاحبؒ اپنے مخصوص انداز میں ان سے مخاطب ہوتے اور سُکر و صحو کی ملی جلی کیفیت میں جواب دیتے جنہیں متعلقہ افراد فوراً سمجھ جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بابا صاحبؒ کوئی ذکر فرماتے یا کسی کا نام لیتے اور اس کے متعلق کچھ کہتے اور کچھ دیر بعد وہ شخص حاضر ہوتا اور بالکل وہی باتیں کرتا جس کا انکشاف بابا صاحبؒ پہلے ہی کر چکے ہوتے تھے۔

واکی میں قیام

کچھ عرصہ شکردرا میں راجہ رگھوجی کے پاس رہ کر بابا تاج الدینؒ واکی چلے گئے۔ یہاں آپ کاشی ناتھ پٹیل کے پاس ٹھہرے۔ کاشی ناتھ نے بابا صاحب کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ بابا صاحب کو بے آرامی نہ ہو۔

اب لوگوں کا رُخ واکی کی طرف ہوگیا۔ جہاں بابا صاحب بیشتر وقت میدانوں اور جنگلوں میں گزارتے تھے۔ بابا صاحب لمبا کُرتا پہنتے، ننگے پیر گھومتے رہتے اور لوگ ساتھ ساتھ چل کر عرض پیش کرتے۔

واکی میں بابا صاحبؒ کی قیام گاہ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر آم کا ایک درخت تھا۔ بابا صاحبؒ اس مقام کو شفا خانہ کہتے تھے۔ مایوس العلاج مریض وہاں آکر ٹھہرتے تھے۔ بابا صاحبؒ خود بھی آنے والے مریضوں کو شفا خانے میں رکنے کا حکم

دیتے تھے۔

شفاخانے کے قریب ایک جگہ کو باباصاحبؒ نے مدرسہ قرار دیا تھا۔ جو طالب علم دعا یا فہم و فراست میں اضافہ کے لئے دربارِ تاج الاولیاء میں حاضر ہوتے، باباصاحبؒ انہیں مدرسہ میں قیام کا حکم دیتے۔ آج بھی لوگ حافظہ کی صلاحیت اور دماغ کی تیزی کے لئے "مدرسہ" میں ٹھہرتے ہیں۔

باباصاحب نے اپنی جائے قیام کے پاس ایک جگہ کو مسجد کا نام دیا تھا۔ باباصاحبؒ جہاں بھی گئے ایک نہ ایک مقام کو مسجد ضرور قرار دیا منتشر الخیال اور شکوک و وسوسوں میں گرفتار افراد کو باباصاحب "مسجد" میں نماز کا حکم دیتے تھے۔

شکردرہ کو واپسی

واکی کے دورانِ قیام بھی راجہ رگھوجی پابندی سے باباصاحب کی خدمت میں آتے تھے اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ راجہ صاحب کا اخلاص اور ان کی نیازمندی ایک بار پھر بابا تاج الدین کو شکردرہ کھینچ لے گئی۔

شکردرہ میں باباصاحب راجہ رگھوجی کے محل میں ٹھہرے۔ راجہ کا محل ناگپور اسٹیشن سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مرکزی سڑک سے ایک چھوٹی سڑک راجہ کے محل کو جاتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں کنارے جھونپڑیوں میں باباصاحب کے خدمت گزار اور فیض یافتگان رہتے تھے۔ جنہیں عرفِ عام میں باباصاحب کے بچے کہا جاتا تھا۔ یہ باباصاحب کی شخصیت تھی جس نے شکردرہ کو ایک شہر کی مانند بنادیا تھا اور یہاں ہر وقت لوگوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔

معمولات

بابا تاج الدینؒ وقت اور معمول کے پابند نہ تھے۔ واکی کا زمانۂ قیام ہو یا شکردرہ کا دورِ سکونت۔ لوگ دیکھتے کہ بابا صاحب کبھی ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں تو کچھ دیر بعد جنگل میں کسی درخت کے نیچے تشریف فرما ہیں۔

شکردرہ میں صبح چار بجے بابا صاحب کی خدمت میں چائے پیش کی جاتی اور اس وقت سے لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ بابا صاحب کبھی چائے پی لیتے، کبھی کسی کو دے دیتے۔ کبھی کچھ پی کر باقی حاضرین کو عنایت کر دی جاتی دن نکلنے کے بعد بابا صاحب اکثر محل سے باہر نکلتے۔ شکردرہ محل کے باہر دکان دار، راجا کے نوکر اور زائرین اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے لیکن ان کی منتظر نظریں وقفے وقفے سے محل کے دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور جوں ہی بابا صاحب محل سے باہر آتے، ایک شور بلند ہوتا کہ بابا صاحب آرہے ہیں۔ مٹھائی والے مٹھائی لے کر دوڑتے، پھول والے گجرے اٹھا کر بھاگتے اور زائرین بابا کے پیچھے پیچھے چل پڑتے۔ محبین پھول نچھاور کرتے رہتے۔ کوئی بڑھ کر گجرا گلے میں ڈال دیتا۔ بابا صاحب چلتے چلتے کسی مقام پر بیٹھ بھی جاتے۔ لوگ پھول اور مٹھائی پیش کرتے، کوئی نذر پیش کرتا۔ بابا صاحب بڑبڑاتے ہوئے سائلین کو جواب دیتے رہتے۔ ہجوم کی وجہ سے بابا صاحب کا شفقت بھرا لہجہ کبھی کبھی پیار بھری ڈانٹ میں تبدیل ہو جاتا۔ خفا ہو کر مار بھی دیتے لیکن فدائین پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

بابا صاحب کبھی شہر کی طرف جاتے اور کبھی جنگل کا رُخ کرتے۔ جنگل کی طرف پیدل بھی چل دیتے لیکن اکثر سواری پر جاتے تھے۔ سواری کے لئے بیل گاڑی یا تانگہ

ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ تر تانگے میں سفر کرتے تھے۔ بابا صاحب محل سے نکل کر جب دور تک پیدل چلے جاتے تو لوگ کوشش کرتے کہ کسی طرح بابا صاحب تانگہ میں سوار ہو جائیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ بابا صاحب خود سواری طلب کرتے۔ ہیرالعل نامی کوچوان تانگہ حاضر کرتا۔ تانگے کے گھوڑے کا نام بابا صاحب نے "بہادر" رکھا تھا۔ بابا صاحب تانگے میں سوار ہو جاتے تو ایک پہلوان سامنے اور ایک پائیدان پر بیٹھ کر ساتھ جاتے تھے۔ "بہادر" گھوڑا بابا صاحب کے اشارے کا منتظر رہتا تھا۔ جوں ہی بابا صاحب کی زبان سے نکلتا "بڑھاؤ" گھوڑا خود ہی سرپٹ دوڑنے لگتا۔ کوچوان کو باگیں کھینچنے اور دائیں یا بائیں اشارہ دینے کی اجازت نہ تھی۔ بہادر از خود سڑکوں اور جنگلوں کے راستوں پر دوڑتا رہتا۔ جیسے ہی تانگہ شکردرہ سے نکلتا، زیارت و قدم بوسی کے لئے لوگوں کا ہجوم ہو جاتا۔ اور ہجوم کے اکثر لوگ تانگے کے ساتھ دوڑتے رہتے۔ بابا صاحب شہر کا گشت کرتے، کسی کسی جگہ گاڑی رکوا کر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ ہر جگہ رُکنے میں کوئی رمز پوشیدہ ہوتا تھا۔ اکثر دُور سے آئے ہوئے لوگ جو بابا صاحب سے ملاقات کے متمنی ہوتے تھے اور ملاقات کا موقع حاصل نہیں ہو پاتا تھا، بابا صاحب ان سے ملتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کہیں رُک کر مصیبت زدوں اور پریشان حالوں کو تسلی دیتے۔

بابا صاحب پیدل جنگل کا رُخ کرتے تو لوگ کھانا اور چائے لے کر ساتھ جاتے۔ بابا صاحب اکثر دوپہر کا کھانا جنگل میں کھاتے تھے۔ کبھی خود طلب کرتے اور کبھی وقت ہونے پر لوگ پیش کرتے۔ ہر شخص اپنا توشے دان کھول کر بابا صاحب کے سامنے پیش کرتا۔ بابا صاحب کسی توشے دان میں سے کچھ کھا لیتے اور باقی کھانا زائرین

میں تقسیم ہو جاتا۔ بابا صاحب دال چاول شوق سے کھاتے تھے اور کبھی کبھی یہ شعر پڑھتے۔

دال چاول اپیٹر کا پھول   یہ نہ کھایا تو مٹی دھول

جنگل میں کئی کئی دن قیام رہتا۔ کبھی کسی گاؤں میں چلے جاتے اور کبھی گاؤں سے
باہر ہی رہتے۔ لوگ جنگل میں بھی بابا صاحب کے ساتھ مقیم رہتے۔ دربار تاج الاولیاء
کے آداب میں یہ بات شامل تھی کہ کوئی بغیر اجازت واپس نہیں جاتا تھا۔ بعض لوگوں
کو ملاقات کے بعد ہی جانے کی اجازت مل جاتی اور بعض ہفتوں وہاں رہتے۔ حاضرینِ
دربار موسم کی سختیاں اور مسافرت کے دن برداشت کرتے لیکن جانے کا نام
نہیں لیتے تھے۔

اندازِ گفتگو

بابا تاج الدین کا لب و لہجہ مخصوص تھا۔ آپ مدراسی لہجے میں
گفتگو کرتے تھے۔ اردو بولنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ سوچ
کر بولنا پڑتا تھا۔ پھر بھی الفاظ میں کچھ ایسا زور ہوتا تھا کہ سامعین ان کا مافی الضمیر
فوراً سمجھ جاتے تھے۔ بات مختصر اور پُر معنی ہوتی تھی۔ کبھی مثالی زبان میں بات کرتے
تھے جس کا مطلب ایک ذہین شخص فوراً نکال سکتا تھا۔ اکثر قرآنی آیات کو
گفتگو میں اس طرح استعمال کرتے تھے کہ سائل کے مسئلے کا حل اس میں موجود
ہوتا تھا۔

صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی بابا صاحبؒ اپنی
گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کر جاتے تھے جو براہِ راست قانونِ قدرت
کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ بعض دفعہ اشاروں ہی اشاروں میں وہ ایسی بات
کہہ جاتے تھے جس میں کراماتوں کی علمی توجیہ ہوتی اور سننے والے کی آنکھوں کے

سامنے یکبارگی کرامت کے اصولوں کا نقشہ آجاتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے ذہن
سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا
بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین ہر وہ بات من و عن اپنے ذہن میں سمجھتے
اور محسوس کرتے جا رہے ہیں جو بابا صاحب کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔

بابا صاحب چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے گاہے بہ گاہے کچھ بول دیتے۔ عام
آدمی ان جملوں کو بے ربط بات سمجھ کر قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اس میں کسی کے
مسئلے کا حل، سوال کا جواب یا کسی نکتہ کی وضاحت پوشیدہ ہوتی تھی۔

رحمت و شفقت

اگر بابا تاج الدین کی مصروفیات کو چند الفاظ میں سمیٹا
جائے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر لمحہ مخلوقِ خدا کے
لئے وقف تھا۔ آپ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں آرام کر پاتے تھے۔ باقی وقت لوگوں
کی غرض سنتے یہاں تک کہ کھانے پینے کے اوقات بھی نظر انداز ہو جاتے۔ رات دن
حاجت مند اور پریشان حال آتے رہتے۔ بابا صاحب اپنے مخصوص انداز میں انہیں
تسلی دیتے اور مشکل کے حل کی طرف اشارہ فرماتے۔ بابا صاحب کی ہستی لوگوں کے
لئے لطف و محبت اور کرم نوازی کا ایسا ذریعہ تھی جس کے آگے انہیں ہر تکلیف اور
صعوبت ہیچ محسوس ہوتی تھی۔ بابا صاحب ڈھارس بندھاتے تو انہیں ایسا اطمینان
مل جاتا جو کسی مادی ذریعے سے ملنا ممکن نہیں۔ دل کے بوجھ یوں دور ہو جاتے جیسے
کسی انجانے ہاتھ نے غم کے پہاڑ سینے پر سے ہٹا دیئے ہوں۔

آخری زمانے میں جب بابا صاحب کی صحت گر گئی تھی اور کمزوری کی
وجہ سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں کے معاملات سننے اور جواب دینے

میں دلچسپی لیتے رہے۔ حالتِ جلال ہو یا جمال کبھی کسی کو باباصاحب کی ذات سے تکلیف نہیں پہنچی۔ بارہا دیکھا گیا کہ لوگ رنجیدہ آئے اور خوش و خرم واپس گئے۔ باباصاحب بعض اوقات ہجوم میں گھر جاتے تو بلند آواز سے فرماتے "تم سب جاؤ۔ تمہارے کام ہو گئے۔" لوگ مطمئن واپس جاتے اور اللہ تعالےٰ ان کے کام بنا دیتا۔

باباصاحب کے پاس زمانے کے ستائے ہوئے بھی آتے، حالات کے مارے بھی آپ کے در کا رُخ کرتے، خطاکار بھی احساسِ گناہ لے کر حاضر ہوتے۔ ایسے لوگ بھی دربارِ تاج الاولیاء میں آتے جو امارت کے باوجود پریشان حال ہوتے اور ایسے بھی فریاد کناں ہوتے جن پر غربت ایک بوجھ بن گئی ہوتی۔ باباصاحب بلا امتیاز امیر و غریب، خطاکار و پاک باز سب کی عرض و فریاد سنتے۔

ایک بار ایک طوائف باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور گا کر کہا ؎

اچھے رہیں نزدیک بُرے جائیں کدھر کو
اے رحمتِ خدا! تجھے ایسا نہ چاہیئے

یہ سنکر باباصاحبؒ نے اس سے کہا ؎

اچھے اُدھر کو جائیں، آئیں بُرے اِدھر کو
اے رحمتِ خدا، تجھے ایسا ہی چاہیئے

ایک لڑکا پیدائشی معذور تھا۔ نہ بول سکتا تھا اور نہ ہاتھ پیر ہلا سکتا تھا۔ والدین نے حتی المقدور علاج کرایا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ وہ لڑکے کو شکردرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد باباصاحب اندر سے باہر تشریف لائے اور معذور لڑکے کے پاس پہنچ کر کھانا طلب کیا۔ لوگوں نے فوراً کھانا پیش کیا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے

اُسے آدھ گھنٹے تک لقمہ لقمہ کر کے کھانا کھلایا، اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا اور ایک آدمی اس کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا۔ باباصاحب کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ دربار میں حاضر ہونے والے لوگ اس لڑکے کی خدمت اپنے لئے عزت کا باعث سمجھنے لگے اور وہ لڑکا جب تک زندہ رہا کبھی کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہوا۔

ایک دفعہ باباتاج الدینؒ قصبہ پاٹن ساؤنگی کی گلیوں سے گزر رہے تھے اور جلوس کے ساتھ سینکڑوں لوگ موجود تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں ایک بوڑھیا اور بوڑھا جوار پیس رہے ہیں۔ مگر ضعف و ناتوانی کی بنا پر چکی چلانے میں دقت ہو رہی ہے۔ باباصاحب تانگے سے اتر کر مکان میں گئے اور خود آٹا پیسنے لگے۔ تھوڑی دیر میں تمام جوار پیس کر آٹا ان کے حوالے کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ایک رات باباصاحب کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا "پہلے ہمارے مہمان کو کھلاؤ جو درخت کے نیچے ٹھہرا ہوا ہے۔ تب میں کھاؤں گا۔" لوگوں نے کئی جگہ دیکھا مگر کسی ایسے شخص کو پانے میں ناکام رہے جس پر باباصاحب کے الفاظ صادق آتے ہوں۔ باباصاحب سے دوبارہ کھانے کی درخواست کی گئی تو وہی جواب ملا کہ پہلے ہمارے مہمان کو کھلا کر آؤ۔ لوگ ایک دفعہ پھر تلاش میں نکلے۔ ایک درخت کے نیچے کوئی صاحب بیٹھے نظر آئے۔ لوگوں نے ان کا حال پوچھا تو پتہ چلا کہ کسی دور دراز جگہ سے مفلسی کے عالم میں آئے ہیں اور باباصاحبؒ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ باباصاحب نے آپ کے لئے کھانا بھیجا ہے۔

ایک بار باباصاحب گھومتے ہوئے ڈگوری کی طرف گئے۔ عبداللہ دکھنی نامی شخص کا یہ ذمہ تھا کہ جب باباصاحب ڈگوری کی طرف جاتے وہ ساتھ جانے والے لوگوں کو پانی پلاتے۔ چنانچہ اس دن بھی پانی کا گھڑا ساتھ لیئے ہوئے ڈگوری پہنچے وہاں پہنچ کر باباصاحب کو پانی پیش کیا تو انہوں نے پانی پینے سے انکار کر دیا۔ کہا "گھوڑے کو پلا کر آ، تب پیوں گا۔" قریب ایک فرلانگ دور گھوڑا کھڑا تھا۔ عبداللہ دکھنی پانی لے کر گھوڑے کے پاس پہنچے۔ گھوڑا اتنا پیاسا تھا کہ پانچ برتن پانی پی گیا۔

مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ سینکڑوں واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ باباصاحبؒ کی ذات مخلوقِ خدا کے لئے مجسم شفقت اور محبت تھی اور آپ نے خود کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

تعلیم و تلقین

باباصاحب دو بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے۔ ایک اللہ تعالےٰ سے تعلق اور دوسرا اخلاصِ عمل۔ باباصاحب کو مردم آزاری اور ظلم سخت ناپسند تھے۔

باباصاحبؒ کہتے تھے "اللہ اللہ کرتے اچھے رہتے۔" اللہ تعالےٰ سے رابطہ دین کی روح ہے۔ اور صلوٰۃ ہو یا ذکرِ الٰہی سب اسی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ باباصاحبؒ کا منشا یہ تھا کہ اللہ سے تعلق خاطر ویسا ہونا چاہیئے جو ایک بندے اور خالق کے درمیان ضروری ہے۔

حاضرینِ دربار کے فکر و عمل کی خامی کو باباصاحبؒ نہایت لطیف پیرائے میں ظاہر کرتے تھے، اس طرح کہ وہ سمجھ بھی جائیں اور ان کی پردہ پوشی بھی رہے۔ کسی بات کی تلقین فرماتے تو اکثر تمثیلی زبان استعمال کرتے۔

خدائے رام نامی ایک سود خور داکی میں باباصاحب کے پاس آیا۔ تو باباصاحب نے ایک لکڑی اٹھائی اور مارتے ہوئے کہا "بڑا ظالم ہے، مخلوق کو ستاتا ہے۔" پھر فرمایا "سود لینا چھوڑ دے۔" خدائے رام پر اتنا اثر ہوا کہ عمر بھر وہ باباصاحب کے پاس رہا اور سودی کاروبار چھوڑ دیا۔

ایک پیر صاحب باباصاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ حضور! دعا فرمائیں کہ مجھے روحانیت میں ترقی نصیب ہو۔

باباصاحب نے فرمایا: "کتّا مار کر لاؤ، ہم دونوں کھائیں گے۔"

باباصاحبؒ کا اشارہ اس حدیث شریف کی طرف تھا کہ "دُنیا مُردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔"

مولانا یوسف شاہ صاحب کی ایک درویش سے راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ تعلقات دوستی میں بدل گئے۔ وہ درویش کیمیا جانتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو ترکیب بتا دی۔ مولانا نے سوچا اگر باباصاحب اجازت دے دیں تو بلا محنت و مشقت کے بہت اچھا ذریعۂ آمدنی ہو جائے گا۔ باباصاحب کے پاس پہنچے تو باباصاحب رح نے فرمایا "غلاظت کھانا چاہتے ہو؟" مولانا فوراً سنبھل گئے۔

ایک صاحب کو یہ زعم تھا کہ میں باباصاحب سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ باباصاحب نے ان سے کہا "ہم سے کم کسی کو نہیں سمجھتے۔"

اکثر طوائفیں بھی حاضر ہوتی تھیں۔ لوگوں کو یہ بات عجیب دکھائی دیتی تھی لیکن باخبر لوگوں کو پتہ تھا کہ شاید ہی کوئی طوائف ہو جس کی حالت دربار میں حاضر ہونے کے بعد

بدل نہ گئی ہو۔ طوائفوں کو مختلف پیرائے میں حکم دیتے تھے۔ مثلاً فرماتے تھے: اماں، سواری کے لئے ایک گھوڑا پسند کر لو۔

ایک دفعہ بابا تاج الدین کے چند نام لیوا شکر درہ میں بابا صاحب رح کی جائے قیام سے کچھ فاصلے پر بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، میں تم سب لوگوں پر فوقیت رکھتا ہوں اس لئے کہ میں ساری جائداد چھوڑ کر بابا صاحب کی خدمت میں آیا ہوں۔ دوسرے نے کہا، میری قربانی تم سے کم نہیں ہے۔ میں تو پوری دکان چھوڑ کر حاضر ہوا ہوں۔ غرض ہر شخص اپنی بڑائی جتا رہا تھا۔ اسی لمحہ بابا صاحب محل سے باہر نکل کر ان لوگوں کے پاس آئے اور یہ قرآنی آیت پڑھی۔

ترجمہ : لوگ اسلام لانے کا آپ پر احسان دھرتے ہیں۔ کہہ دو اے نبیؐ! تم اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر نہ رکھو۔ یہ تو اللہ کا احسان ہے تم پر کہ تم کو ایمان کی طرف رہنمائی فرمائی۔ (پ ۲۶، ع ۱۴)

مختصر یہ کہ جلالی و جمالی کیفیت میں اشاروں، کنایوں اور تمثیلی اندازِ بیان کے ذریعے حاضرین کو تلقین جاری رہتی اور بنیادی نکتہ یہی ہوتا کہ لوگ حرص و ہوس سے آزاد ہو جائیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ کبھی کبھی تیز و تند لہجہ بھی اختیار کر لیتے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ بابا آپ لوگوں کو سخت و سُست کیوں کہتے ہیں؟ جواباً فرمایا: "بیٹا رے، میں تو انہیں دُعا دیتا ہوں۔"

کشف و کرامات

انبیاء اور رسولوں سے معجزات کا ظہور ہوا اور ختمِ نبوت و رسالت کے بعد یہ وراثت اولیاء اللہ کو منتقل ہوئی۔ علمِ نبوت کے زیرِ سایہ جو خرقِ عادت اولیائے کرام سے صادر ہوئی وہ کرامت کہلائی۔ ان پاک طینت حضرات سے کرامات کا اظہار بطور رُشد و ہدایت اور تعلیم و تنبیہ کے ہوا۔

بابا تاج الدینؒ ناگپوری کی ذات بابرکات کشف و کرامات کے ضمن میں ممتاز و منفرد ہے۔ بابا صاحبؒ کا ذہن فطرت کی قوتوں میں اس قدر جذب تھا کہ آپ سے خرقِ عادت بطور عادت سرزد ہوتی تھی۔ بابا صاحبؒ کی ذات میں یہ عجیب خوبی بھی دیکھی گئی کہ ان سے کشف و کرامت کا اظہار غیر ارادی طور پر ہو جاتا تھا۔ ارادہ یا ذہن کی قوت استعمال کر کے تصرف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

بابا صاحبؒ کا یہی طرزِ ذہن تھا جس کی وجہ سے ان کے کشف و کرامات کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا جائے تو کشف و کرامات کا باب ہی ایک الگ کتاب بن جائے گا۔ بابا صاحبؒ کی گفتگو، ان کے اٹھنے بیٹھنے، معمولات و مصروفیات سب میں کرامت کے پہلو موجود ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر

کشف و کرامات کے باب میں بابا صاحب کی منتخب کرامات، کشف اور تصرفات کو شامل کیا گیا ہے۔

اب تک بابا تاج الدین سے متعلق جتنے تذکرے شائع ہوئے ہیں ان میں قلندر بابا اولیاءؒ کی تصنیف "تذکرہ تاج الدین باباؒ" کے علاوہ کسی تذکرے میں اس طرزِ فکر یا ان قوانین کو سامنے نہیں لایا گیا ہے جن کے تحت کرامات صادر ہوتی ہیں۔ "تذکرہ تاج الدین بابا" میں جو کرامات بیان کی گئی ہیں ان کو فیض یافتگان کے باب میں قلندر بابا اولیاءؒ کے تذکرے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ "تذکرہ تاج الدین بابا" کی طرز کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے بابا تاج الدینؒ کی بعض کرامات و تصرفات کے ساتھ اُن قوانین کو بھی بیان کیا ہے جن کی بنیاد پر کسی کرامت کا صدور ہوتا ہے۔

بابا تاج الدینؒ کے تذکرے اور کرامات پر مبنی ایک کتاب "تاج قطبی" بابا صاحب کے زمانۂ حیات میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف قطب الدین صاحب تھے۔ اور سن اشاعت ۱۹۱۱ء تھا۔ ہم کرامات کا بیان "تاج قطبی" کی منتخب کرامات سے شروع کرتے ہیں۔

آگ

بابا حضور پاگل خانہ جانے سے پہلے چار سال کامٹی میں مقیم رہے یہ اس زمانے کا واقعہ ہے اور یہی پہلا کرشمۂ ولایت ہے۔

ایک رات آپ ایک زرگر کے مکان میں داخل ہوئے اور اس سے ارشاد فرمایا: "فوراً مکان سے سامان نکال اور یہاں سے نکل جا۔"

اس نے سوچا کہ یہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں نے ان کے حُکم کی تعمیل نہ کی تو شاید کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ چنانچہ اس نے گھر سے سامان نکال لیا اور مکینوں

کو بھی باہر کر دیا۔ اور پھر اس مکان میں آگ بھڑک اٹھی۔ اور مکان جل گیا۔

مقدمہ

ایک روز آپ کامٹی میں حضرت سید صاحب کے مزار کے قریب ٹہل رہے تھے۔ ایک مارواڑی پر کسی نے مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ وہ اس کی پیروی کے لئے کچہری جا رہا تھا اور پریشان حال تھا۔ آپ اسے دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنسے اور فرمایا: "نالش تو خارج ہو گئی۔"

اس نے سوچا کچہری جا کر دیکھنا چاہیئے۔ جا کر دیکھا تو مقدمہ واقعی خارج ہو چکا تھا۔ وہ صدقِ دل سے شیرینی لے کر حاضرِ خدمت ہوا۔ آپ نے حکم دیا: "ہم کو کیا دیتا ہے، بچوں کو تقسیم کر دے۔"

کامٹی میں اس قسم کے بہت سے واقعات ظہور میں آئے۔ اس کے بعد پاگل خانے میں آپ کی تشریف آوری ہوئی جہاں ایسے بہت سے واقعات ظہور میں آئے۔

طمانچے

ایک روز ایک پاگل جب دوسرے پاگلوں کے ساتھ کام پر پاگل خانے سے باہر گیا تو محافظ کی نظروں سے بچ کر فرار ہو گیا۔ اور اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔ شام کو گنتی کے وقت جب وہ پاگل خانے میں نظر نہ آیا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمجید خاں صاحب مرحوم بہت پریشان ہوئے اور ماتحت ملازمین پر خفا ہونے لگے۔ اسی دوران بابا حضور تشریف لائے اور فرمایا: "کیوں گھبراتے ہو، وہ کل خود چلا آئے گا۔"

چنانچہ دوسرے دن وہ پاگل از خود گیٹ پر موجود تھا۔ پاگل خانے کے ملازمین نے اسے اندر بلا لیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی۔ انہوں نے آکر اسے

پوچھا کہ تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو اس نے اپنی زبان میں جواب دیا کہ اپنے گاؤں گیا تھا۔ پھر یہی پوچھا گیا تو اس نے دوبارہ یہی جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ تو واپس کیسے آگیا تو اس نے جواب دیا "بھائی تاج الدین نے مجھے دو طمانچے مارے اور کہا کہاں جاتا ہے، چل پاگل خانے اور مجھے کھینچ کر لے آئے۔

پتہ اور انجن

ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے ایک تقریب میں شرکت کے لئے بمبئی جانے کا ارادہ کیا۔ اور حضرت بابا جان تاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا "مت جاؤ۔ راستہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔"

جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے درخت سے پتہ توڑ کر دیا اور فرمایا کہ اس کو ساتھ لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بمبئی روانہ ہوئے۔ راستے میں ایسا خطرناک واقعہ پیش آیا کہ ان کی جان بچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر صاحب کسی ضرورت کی وجہ سے بھساول ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ وہ ریلوے لائن پار کر رہے تھے کہ اچانک ریلوے انجن ان کے بالکل قریب آگیا۔ اور اس کی دہشت سے وہ ریلوے لائن پر ہی گر پڑے۔ حالاں کہ انجن پوری رفتار سے آرہا تھا۔ لیکن جوں ہی ان کے نزدیک آیا، رک گیا۔ ریلوے کے ملازمین نے آپ کو لائن پر سے اٹھایا اور کہا "کیا آپ کوئی عامل ہیں، انجن روکے بغیر خود بخود کیسے رک گیا؟"

اس پر ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو بابا حضورؒ کی جانب سے روانگی کی ممانعت اور پھر درخت کے پتے کا پورا واقعہ سنایا۔

سول سرجن

ایک اور پاگل خانے میں حکام کی ماہانہ میٹنگ تھی سول سرجن کی نشست کے برابر ایک کرسی خالی تھی۔ بابا حضور نے اس کو دیکھ کر ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب سے کہا "تم کیوں کھڑے ہو، اس پر بیٹھ جاؤ۔ تم بھی وہاں بیٹھ سکتے ہو۔" آپ نے یہ بات دو تین بار کہی۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو سرجن جنرل نے ڈاکٹر صاحب کو بلایا اور کہا "ہم تم کو اسسٹنٹ سرجن مقرر کرنا چاہتے ہیں۔"

قریب المرگ لڑکی

ایک شخص جس کی بیٹی بہت بیمار بلکہ قریب المرگ تھی بابا حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور شفا کے لئے دعا کی درخواست کی۔ اس کی گزارش سننے کے بعد آپ چند لمحے خاموش رہے اور پھر کچھ دیر آنکھیں بند کرنے کے بعد ہنس کر فرمایا "جا بابا، لڑکی تو اچھی ہو گئی۔" وہ شخص بہت خوش ہوا اور بے قراری کے عالم میں گھر پہنچا۔ دیکھا تو بچی بالکل ٹھیک تھی اور کھانا کھا رہی تھی۔ گھر والوں سے پوچھا کہ بچی یک بیک کیسے صحت یاب ہو گئی؟ انہوں نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک سائل دروازے پر آیا۔ جب اس کو خیرات دی گئی تو اس نے ہماری غم زدہ حالت دیکھ کر خود پوچھا کہ تمہارے گھر میں کیا پریشانی ہے۔ ہم نے کہا کہ کیا بتائیں، ہماری بچی کوئی دم کی مہمان ہے۔ سائل نے کہا چلو ہم دیکھیں گے ہم انہیں گھر میں لے آئے۔ تھوڑی دیر وہ بیمار کے قریب کھڑے رہے اور پھر فرمایا اچھی ہو جائے گی غم نہ کرو۔" ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بچی ہوش میں آگئی اور کھانے کو مانگا۔

اجنبی بیرسٹر

منشی اصغر علی صاحب ناگپوری جو سیونگ مشین کمپنی میں ملازم ہیں، بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے جناب دیدار بخش، پوسٹ ماسٹر ناگ پور پوسٹ آفس کی زبانی سنا ہے کہ بابو رام سنگھ نامی ایک سرکاری ملازم تھے۔ ان کے خلاف کوئی سرکاری جرم عائد ہوا اور مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ انہوں نے بری ہونے کی ہر تدبیر کی اور جب مایوس ہو گئے تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر گریہ و زاری کی۔ آپ نے فرمایا "چلا جا، کیا ہوتا ہے، بری ہو جائے گا۔" یہ سن کر وہ شخص خوشی خوشی واپس آگیا۔ مقررہ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہوا اور طلبی پر عدالت میں پیش ہوا۔ فریقِ مخالف کی طرف سے وکیل بھی موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اجنبی بیرسٹر عدالت میں آئے اور کہا: "میں بیرسٹر ہوں اور فلاں شہر میں رہتا ہوں۔" انہوں نے کوئی دور دراز شہر کا نام بتایا اور کہا کہ میں رام سنگھ کی طرف سے اس کے مقدمے کی پیروی کروں گا۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ بحث کے دوران بیرسٹر صاحب نے کوئی قانونی نکتہ اٹھایا جس کا فریقِ مخالف کوئی جواب نہ دے سکا اور معذرت کے ساتھ بیرسٹر صاحب کی بحث اور اعتراض کو معقول قرار دیا۔ اس پر بیرسٹر صاحب نے کہا کہ گزشتہ تمام کارروائی بے ضابطہ تھی اور مقدمے کی روئداد سے ملزم قطعی بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا ملزم کو آج ہی کیوں نہ بری کیا جائے؟

عدالت نے بیرسٹر صاحب کی تجویز منظور کی اور ملزم کو اسی وقت بری کر کے مقدمہ خارج کر دیا۔ بیرسٹر صاحب عدالت سے روانہ ہوئے تو رام سنگھ بھی آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چلا۔ تھوڑی دور جا کر رام سنگھ نے بیرسٹر صاحب کے سامنے آکر

عرض کیا: "سرکار! یہ نکتہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میرے بلائے بغیر اس مقدمے کی پیروی کے لئے کیسے آگئے؟"

بیرسٹر صاحب نے فرمایا: "تجھے کیا ضرورت ہے۔ آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ جس سے تو نے مقدمے میں مدد طلب کی ہے، اسی نے مجھے پیروی کے لئے بھیجا ہے۔ اب تو اپنے گھر جا، ہم اپنے گھر جاتے ہیں۔"

دنیا سے رخصتی

ایک روز میں (مصنفِ تاج قطبی) نے کامٹی میں ارادہ کیا کہ پاگل خانے جا کر درخواست کروں کہ میرے فرزند فخر الدین کے لئے شفا کی دعا فرمائیں جو چار مہینے سے سخت بیمار تھا۔ تقریباً بارہ بجے پاگل خانے میں داخل ہوا۔ آپ نے فرمایا: "کس لئے دعا کریں۔ وہ تو دنیا سے رخصت ہو گیا۔" اور پھر وہ الفاظ آپ نے فرمائے جو گزشتہ شب میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ وہ الفاظ جو میں نے اپنے دل میں رکھے تھے، بابا حضور نے یک بیک کیسے کہہ دیئے۔ مجھے صبر کی تلقین فرمائی۔ جب میں وہاں سے لوٹا تو راستے میں ایک شخص نے بتایا کہ گیارہ بجے بچے کا انتقال ہو گیا۔ میں نے گھر جا کر میت کی تجہیز و تکفین کی۔

جبلِ عرفات

میرے ایک معتمد اور متقی دوست عبدالرحمٰن ساکن ایرٹ ذکر کرتے ہیں کہ ایک بزرگ شخص حجِ بیت اللہ کے لئے گئے۔ انہوں نے بابا حضور کو جبلِ عرفات پر دیکھا اور اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی صاحبِ اختیار بزرگ ہیں۔ انہوں نے بابا صاحب سے ملاقات کی اور ان کا نام اور پتہ دریافت کیا۔ فرمایا کہ میں ناگ پور کی پاگل جھونپڑی میں رہتا ہوں۔ اور نام

تاج الدین ہے۔ اتنا فرما کر آپ وہاں سے چل دیئے۔ اور پھر ان کو نہ ملے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد وہ صاحب جب اپنے وطن ہندوستان آنے لگے تو انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ گھر واپس پہنچنے سے پہلے ناگ پور جا کر ان بزرگ کا دیدار کریں گے جو جبلِ عرفات پر ملے تھے۔ چنانچہ وہ ناگ پور آئے اور پاگل جھونپڑی کی تلاش شروع کی۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں پاگل جھونپڑی تو کوئی نہیں البتہ ایک پاگل خانہ ضرور ہے۔ اور وہاں ایک بزرگ بھی ہیں جن کی تفصیل تم بتا رہے ہو۔ وہ پاگل خانے آئے۔ بابا حضور نے ایک گھنٹہ پہلے ہی ان صاحب کے آنے کی اطلاع پاگل خانے میں موجود لوگوں کو دے دی تھی۔ یہ صاحب پہنچے تو بابا صاحب نہایت شفقت اور تپاک سے ملاقات و گفتگو کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ گفتگو کے دوران ان صاحب کے دل میں اچانک یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ بزرگ تو بے شک صاحبِ منزل ہیں لیکن ان کا کوئی کشف یا کرامت دیکھنی چاہیئے۔ جس وقت وہ یہ سوچ رہے تھے، بابا حضور کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، فوراً قریب آئے اور اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ان کی دونوں آنکھوں پر رکھ کر ارشاد فرمایا: "کیا بابا! یہی جبلِ عرفات ہے جہاں آپ حج کو گئے تھے ؟"

یہ سنتے ہی ان صاحب نے بند آنکھوں سے دیکھا کہ جبلِ عرفات پر کھڑے ہیں۔ وہی وقت، وہی رونق، وہی مجمع ہے۔ انہوں نے کہا: "بے شک یہی جبلِ عرفات ہے۔ یہ تو آپ نے دکھا دیا مگر مقامِ رب العالمین تو دکھائیے۔"

اس پر آپ نے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر سے ہٹا لیا اور فرمایا: "بابا اتنی دور کون جائے !"

بحالی کا حکم

ایک شخص سرکاری ملازم تھا۔ برطرف ہو گیا۔ بہت اپیلیں کیں مگر بے سود۔ تب وہ اجمیر شریف گیا۔ اور وہاں چند روز قیام کیا۔ کچھ دنوں بعد اسے خواب میں خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت نصیب ہوئی۔ دیکھا کہ عالی جاہ چند لوگوں کے ہمراہ کہیں تشریف لے جا رہے ہیں۔ خواجہ غریب نوازؒ نے اس شخص کو طلب فرمایا اور پھر ارشاد ہوا "تو اپنی ملازمت پر بحال ہو گیا۔" یہ شخص واپس وطن روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ملازمت کی بحالی کا حکم آیا ہوا ہے۔ چند دنوں بعد یہ شخص بابا حضور تاج الدین کے دیدار کے لئے آیا۔ اسے دیکھتے ہی حضور نے فرمایا: "یہاں کیوں آئے ہو۔ ہم کو پہچانتے ہو؟ ہم بھی تو وہاں حاضر تھے جب بڑے صاحب نے تمہاری بحالی کا حکم دیا تھا۔"

دیکھنے کی چیز

منشی محمد حسین مرحوم نے جو تحصیلدار کہلاتے تھے اور جنہوں نے واکی ہی میں رحلت فرمائی، ایک روز عرض کیا کہ میں نے اپنے وطن حیدر آباد کئی خط روانہ کئے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ جس کی وجہ سے طبیعت بہت پریشان ہے۔ بابا حضور نے فرمایا "تمہارے خطوط کہاں ہیں؟" پھر پشت کی طرف ہاتھ ڈال کر تمام خطوط نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور فرمایا۔ "خطوط تو یہیں پڑے ہیں۔"

اسی طرح ایک روز جنگل میں بابا حضور نے تحصیلدار کو ایک درخت کے نیچے چادر بچھانے کا حکم دیا۔ پھر کچھ دیر بعد حکم دیا کہ چادر اٹھا لے۔ انہوں نے دیکھا کہ چادر کے نیچے روپوں کا فرش بچھا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا: "یہ سب میں لے لوں؟"

آپ نے ارشاد فرمایا: "نہیں، یہ صرف دیکھنے کی چیز ہے، لینے کی نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا: "چادر ڈال دے۔"

انہوں نے چادر ڈال دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا: "چادر اٹھا لے۔"

حسب الحکم چادر اٹھائی تو دیکھا کہ روپوں کے فرش کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

لمبی نکو کرورے!

سردار خاں صاحب کا ایک ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ اور اس میں خون کی روانی صحیح نہ رہی۔ اس زمانے میں بابا صاحبؒ پاگل خانے میں جلوہ افروز تھے۔ اور ہر طرف آپ کی شہرت پھیل رہی تھی۔ سردار خاں کو ان کے خسر ساتھ لے کر پاگل خانے پہنچے اور یہ دونوں نیم کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک حاجی صاحب آئے اور بابا صاحب کو پوچھنے لگے۔ لوگوں نے حاجی صاحب کے آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میں حج کر کے آرہا ہوں۔ مکہ میں تاج الدین نام کے ایک صاحب میرے ساتھ رہے اور انہوں نے مجھے اپنا پتہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں ناگ پور کے پاگل خانے میں رہتا ہوں۔ حاجی صاحب کی یہ بات ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ نے بھی سنی جو پاگل خانے کے نگراں ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ تھا کہ بابا صاحبؒ ۱۲ روز سے کمرہ بند ہیں۔ اور جب بھی کمرہ کھولا جاتا تھا بابا صاحبؒ کمرے میں موجود ہوتے تھے۔ دو جگہ بیک وقت موجودگی کی شہادت ملنے سے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ پہلے ہی سے بابا صاحبؒ کے عقیدتمند اور خدمت گزار تھے۔ یہ سنکر بے اختیار ان کی زبان سے بابا صاحب کی شان اور عظمت میں کلمات جاری ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت بابا تاج الدینؒ اپنے کمرے سے باہر آئے اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا: "لمبی نکو کرورے، لمبی نکو کرورے (اس بات کو طول مت دو۔") یہ کہہ کر بابا صاحبؒ سردار خاں صاحب کی طرف مڑے اور اپنی انگلی پکڑ کر کہنے لگے: "بڑی جلن رے، بڑا درد رے۔" بابا صاحبؒ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے اور سردار خاں کو اپنے ہاتھ میں توانائی بحال ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی بار یہ جملے ادا کرنے کے بعد بابا صاحب نے جھٹکے سے انگلیاں چھوڑ دیں۔ سردار خاں نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ پوری طرح کام کر رہا ہے۔ بابا صاحب نے سردار خاں سے کہا: "حاجی سردار خاں جاکر آؤ۔" چنانچہ سردار خاں صاحب کو حج کی سعادت نصیب ہوئی جیسا کہ بابا صاحبؒ نے اشارہ فرمایا تھا۔

بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں بابا تاج الدین رح بہ یک وقت ایک سے زیادہ جگہوں پر دیکھے گئے۔ ایک مرتبہ قلندر بابا اولیاءؒ سے یہ بات پوچھی گئی کہ ایسا ہوتا کیوں کر ممکن ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا: "اس کی بہت آسان مثال فوٹو ہے۔ فوٹو گرافی میں ایک نگیٹو پہلے بنایا جاتا ہے اور پھر اس نگیٹو سے اس کا پوزیٹو حاصل کیا جاتا ہے۔ نگیٹو سے ہم صرف ایک پوزیٹو تصویر نہیں بلکہ جتنی تصاویر چاہیں تیار کر سکتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال روح کی تخلیقات کا ہے۔ روح ایک طرح کا نگیٹو ہے اور گوشت پوست کا جسم اس کا پوزیٹو۔ اگر کسی شخص کے ذہن کا سینس مصفّیٰ اور طاقتور ہے تو وہ چاہے تو خود کو (یعنی اپنی روح کو) پوزیٹو تصاویر کی طرح بہ یک وقت کئی جگہ متشکل کر سکتا ہے۔

اس کی دوسری مثال ٹیلی وژن ہے۔ مرکزی اسٹیشن سے ایک ہی نشریات فضا میں بکھرتی ہیں اور بہ یک وقت ہزاروں لاکھوں جگہوں پر موجود ٹی وی سیٹوں کے پکچر ٹیوب اسے حاصل کر کے پوزیٹو میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک ہی شکل، ایک ہی تصویر بہ یک

وقت ہزاروں جگہوں پر متحرک ہو جاتی ہے۔ اولیاء اللہ اور روحانی طاقت رکھنے والے حضرات اسی اصول پر اپنی روح کی تشریات کو بہ یک وقت کئی اسکرینوں (مقامات) پر متحرک کر دیتے ہیں۔

غیبی ہاتھ

ایک دن ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک بابا تاج الدینؒ ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ بابا صاحبؒ کے چہرے سے جلال برس رہا تھا۔ بابا صاحبؒ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے۔ انہیں یاد آیا کہ بابا صاحب کو تو ان کے کمرے میں باہر سے تالا لگا کر بند کر دیا گیا تھا، پھر آپ یہاں کیسے آ گئے! ابھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ایک نامعلوم آواز گونجی "السّلام علیکم"۔ بابا صاحبؒ نے جواباً کہا "وعلیکم السّلام"۔ ساتھ ہی دیوار سے ایک ہاتھ نمودار ہو کر بابا صاحبؒ کی طرف بڑھا۔ بابا صاحبؒ نے مصافحہ کیا اور ہاتھ غائب ہو گیا۔ بابا صاحبؒ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب دوڑتے ہوئے بابا صاحبؒ کے کمرے تک پہنچے اور دروازہ کھول کر دیکھا تو بابا صاحبؒ مراقبہ کی حالت میں بیٹھے تھے۔

اسی زمانے میں گیارہ پاگل بیک وقت پاگل خانے سے فرار ہو گئے، لیکن اگلے روز خود ہی آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پاگلوں کے پاس کھڑے تھے کہ پاگل خانے کا انگریز افسرِ اعلیٰ آ گیا۔ ابھی ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ اور افسرِ اعلیٰ میں گفتگو ہو رہی تھی کہ بابا تاج الدین وہاں آئے اور انگریز کو مخاطب کر کے کہا: "تو یہاں کیا کرتا ہے، بنگلے پر جا کر میم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔" افسرِ اعلیٰ گھر پہنچا تو اس کی بیوی کے انتقال کا تار موجود تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بابا صاحب کے شیدائیوں میں شمار ہونے لگا۔

میڈیکل سرٹیفکیٹ

سیّد عبدالوہاب صاحب نے بیان کیا۔۔۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کا ذکر ہے۔ میں نے پوسٹ آڈٹ آفس، ناگ پور میں ملازمت کی درخواست دی اور اسی روز شام مجھے ہدایت کی گئی کہ میں میڈیکل آفیسر کا سرٹیفکیٹ پیش کروں کہ میں طبّی لحاظ سے کام کرنے کے لائق ہوں۔ میں میڈیکل آفیسر کے پاس جانے سے ہچکچایا۔ کیوں کہ ان دنوں میں خارش کے مرض میں مبتلا تھا۔ اور میرے جسم پر پھوڑے نکل آئے تھے۔ قوی امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے نوکری کا اہل قرار نہیں دے گا۔ میں پریشان ہو کر گھر گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ خیال آیا کہ جناب عبدالحفیظ صاحب سے مشورہ کرنا چاہیئے جو مجھ پر مہربان اور کرم فرما تھے۔ اور ناگ پور کی کچہری کے نقشہ نویس کے معتمد تھے۔ میں نے ان کے پاس جا کر صورتِ حال بیان کی۔ انہوں نے جواب دیا: "گھبراؤ نہیں۔ تم بابا تاج الدین کے پاس جا کر نہایت ادب اور عجز سے درخواست پیش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ بابا صاحب اس کا حل نکال دیں گے۔" میں اور میرے پھوپھی زاد بھائی جو دیلور میں صفائی انسپکٹر تھے، پاگل خانے پہنچے۔ ہم دونوں نے پھاٹک سے اندر داخل ہو کر چوکیدار سے بابا صاحب کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار ہم کو بابا صاحبؒ کے پاس لے گیا۔ بابا صاحبؒ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے اور سینکڑوں لوگ آپ کے گرد جمع تھے۔ چوکیدار نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ ان الفاظ میں بابا صاحب کو سلام کریں: "السّلام علیک بھائی صاحب"۔ ہم نے ان ہی الفاظ میں بابا صاحب کو سلام کیا۔ بابا صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا: "آؤ مدراسی بھائی۔ میرا وطن بھی مدراس ہے۔ دفتر لے کر آئے ہیں، دفتر لے کر جائیں گے۔" بابا صاحب کے اس طرزِ تخاطب سے سارا مجمع ہماری طرف متوجہ ہو گیا

اور ہمیں بابا تک جانے کا راستہ دے دیا۔ میں جوں ہی بابا صاحب کے قریب پہنچا، بابا صاحب نے حکم دیا: "پیر دباؤ۔" پیر دباتے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ بابا صاحب بالکل بے حس و حرکت ہو گئے، نبض ساکت ہو گئی، سانس رُک گئی اور جسم سرد پڑ گیا۔ یہ حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کبھی بابا صاحب کے دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن کا احساس کرتا، کبھی نبض پر ہاتھ رکھ کر نبض کی حرکت کا معائنہ کرتا۔ لیکن زندگی کے کوئی آثار نہیں پائے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو اطلاع دے دوں کہ بابا صاحب نے اس دنیا سے پردہ فرما لیا۔ دس پندرہ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ میں نے لوگوں سے یہ بات کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ بابا صاحب نے 'یا ہو' کہہ کر آنکھ کھول دی اور اٹھ بیٹھے۔ کچھ فرمایا جسے میں سمجھ نہیں سکا۔ بعد ازاں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "جا کر آؤ حضرت! وہ انگریز کیا کرے گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی چوکیدار نے ہم سے کہا کہ آپ جس کام کے لئے آئے تھے، وہ ہو گیا ہے۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ ہم سلام کے بعد رخصت ہوئے۔

دوسرے دن میں میڈیکل آفیسر کے پاس گیا تاکہ سرٹیفکیٹ حاصل کروں۔ وہاں میرے علاوہ ۳۵ آدمی موجود تھے جو سرٹیفکیٹ کے لئے آئے تھے۔ میرا نمبر سب سے آخری تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے اور باری باری لوگوں کا معائنہ شروع کیا۔ ابھی میرا نمبر آیا ہی چاہتا تھا کہ ڈپٹی چیف کمشنر نے ڈاکٹر صاحب کو بلوایا اور وہ چلے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص باقی ہے تو اس نے کہا، نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تمام لوگوں کے سرٹیفکیٹ تیار رکھو، میں آ کر دستخط کر دوں گا۔ یہ سن کر میں فکرمند ہوا کہ میرا طبی معائنہ تو ہوا نہیں، پھر سرٹیفکیٹ

پر کیوں کر دستخط ہوں گے۔ بہرحال، میں چار بجے آفس گیا تو میرا سرٹیفکیٹ ڈاکٹر نے دے دیا، حالاں کہ میرا معائنہ ہوا نہیں تھا اور اگر ہو جاتا تو میرے پاس ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس واقعہ کے بعد مجھے جب بھی موقع ملتا، بابا صاحب کی قدم بوسی کے لئے جاتا تھا۔

مشک کی خوشبو

ایک دن مغرب کے وقت بابا صاحب کے پاس سے واپس آ رہا تھا کہ صدر دروازے پر ایک صاحب ملے۔ انہوں نے پوچھا: "آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا کہ میں بابا تاج الدین کی خدمت سے واپس آ رہا ہوں۔ اجنبی شخص نے دریافت کیا: "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ بابا صاحب کی خدمت سے واپس آ رہے ہیں؟"

میں اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ تب انہوں نے پوچھا: "آپ بابا صاحب کے پاس کیا کر رہے تھے؟"

میں نے بتایا کہ میں بابا صاحب کے پیر دبا رہا تھا۔ اجنبی نے دونوں ہاتھ سونگھنے کو کہا۔ میں نے ہاتھ سونگھے تو حیران رہ گیا کہ ہاتھوں میں سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ اجنبی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے جسم پر ملنا شروع کر دیئے۔ ہر طرف مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ میں نے بھی اپنے کپڑوں پر اچھی طرح ہاتھ ملے اور گھر واپس آ گیا۔ گھر پہنچ کر بھی کپڑوں میں سے مشک کی خوشبو آتی رہی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ صاحب کون تھے جن سے صدر دروازے پر ملاقات ہوئی تھی اور جن کی وجہ سے مجھے یہ خوشبو نصیب ہوئی تھی۔ اس خوشبو کا عالم یہ تھا کہ کئی سالوں تک ان کپڑوں سے متواتر خوشبو

آتی ہی رہی۔ میں نے ان کپڑوں کو اتار کر تبرکاً اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے۔

ایک بار میں دن کے وقت حضور بابا صاحب کے پاس موجود تھا۔ علی گڑھ جانے والے چند طالب علم ایک فوٹوگرافر کو لائے، خود بابا صاحب کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے اور فوٹوگرافر نے تصویر لے لی۔ جب فوٹوگرافر فوٹو دھو کر لایا تو فوٹو میں لڑکے تو موجود تھے لیکن بابا صاحب قبلہ کی شبیہ موجود نہ تھی۔

شیرو جس زمانے میں بابا تاج الدین واکی میں تھے، شیرو نام کا ایک کتا بابا صاحبؒ کے پاس رہتا تھا۔ شیرو کا یہ کام تھا کہ جب ریل کے آنے کا وقت ہوتا خود ہی اسٹیشن پر پہنچ جاتا اور جو لوگ بابا صاحب کے پاس آتے اُن کی رہنمائی کر کے اسٹیشن سے واکی میں بابا صاحب کی قیام گاہ تک لاتا۔ طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ ریل آ جانے کے کچھ دیر بعد شیرو واکی کی طرف چل پڑتا اور لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔ لوگوں کو شیرو کے معمول کا علم تھا اور جو نئے آنے والے ہوتے انہیں بتا دیا جاتا تھا۔ اگر بابا صاحبؒ اپنی قیام گاہ کے بجائے کہیں اور ہوتے تو شیرو لوگوں کو وہیں لے کر جاتا تھا۔ ایک واقفِ حال صاحب واکی آئے لیکن شیرو کو اسٹیشن پر موجود نہ پا کر وہ سوچنے لگے کہ نہ جانے آج شیرو کیوں نہیں آیا۔ غرض تمام آنے والے خود ہی واکی کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں شیرو کے کام اور اس کی مستعدی کی تعریف کرتے رہے۔ جب سب لوگ بابا صاحبؒ کی قیام گاہ پہنچے تو بابا صاحبؒ وہاں موجود نہ تھے۔ لوگ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے کہ ان کو تلاش کریں۔ یہ صاحب کسی دوسرے راستے سے جنگل کو چلے راستے میں دیکھا کہ شیرو مرا پڑا ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ ابھی کچھ دُور آگے گئے تھے کہ

بابا تاج الدینؒ اسی طرف آتے دکھائی دیے۔ بعد قدم بوسی ان صاحب نے عرض کیا۔ "حضور! آپ کا شیرو جو لوگوں کو آسانی سے آپ تک لاتا تھا، مر گیا۔" یہ سُن کر بابا صاحبؒ نے فرمایا: "نہیں رے! چل دیکھیں کہاں ہے۔"

وہ صاحب بابا صاحبؒ کو لے کر وہاں پہنچے جہاں شیرو پڑا تھا۔ بابا صاحبؒ نے کہا: "اسے ٹوکری میں ڈال کر ہمارے ساتھ لے چلو۔"

جب شیرو کو ٹوکری میں ڈالا گیا تو بابا صاحب نے اس پر اپنا جُبّہ ڈال دیا۔ یہ صاحب ٹوکری لے کر کچھ ہی دُور بابا صاحبؒ کے ساتھ گئے تھے کہ ٹوکری میں حرکت ہوئی اور شیرو ٹوکری سے نیچے کود ا۔ کچھ عرصہ بعد شیرو پھر مر گیا۔ بابا صاحبؒ نے اپنا جُبّہ دے کر حکم دیا کہ اُسے شفا خانے کے پاس دفن کر دو۔

مُردے کو زندہ کر دینا بظاہر بڑی عجیب بات دکھائی دیتی ہے لیکن یہ قانونِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں :-

اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اپنی صفات کا جو علم (علم الاسماء) سکھایا تھا۔ اس میں ایک اسم رحیم بھی ہے۔ رحیم کی صفت ہے تخلیق یعنی پیدا کرنا۔ چنانچہ پیدائش کی جس قدر طرزیں موجودات میں استعمال ہوئی ہیں ان سب کا محرک اور خالق رحیم ہے۔ اگر کوئی شخص رحیم کی جزوی صفت کا فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کو اسم رحیم کی صفت کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے باطن میں کرنا ہوگا۔ نیابت اور خلافتِ الٰہیہ کے تحت انسان کی رُوح کو اسم رحیم کے تصرفات کی صلاحیتیں پوری طرح حاصل ہیں اور اس کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس صفت کے استعمال کا حق بھی حاصل ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی مثال دے کر اس صفت کی وضاحت کر دی ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے :

ترجمہ: اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے۔ پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور میرے حکم سے اور چنگا کرتا ماں کے پیٹ کا اندھا اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑے کرتا مُردے میرے حکم سے۔

اگر کوئی انسان اس صفت کی صلاحیت کو استعمال کرنا چاہے تو اُسے مراقبہ کے ذریعے اپنے اندر اس فکر کو مستحکم کرنا پڑے گا کہ میری ذات اسم رحیم کی صفات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودات کی جس قدر شکلیں اور صورتیں ہیں وہ سب اسم رحیم کی صفات کا نوری مجموعہ ہیں۔ یہ مجموعہ انسان کی رُوح کو حاصل ہے۔ جب کوئی شخص فکر کی پوری مشق حاصل کرنے کے بعد اسم رحیم کی صفت کو خود سے الگ شکل و صورت دینے کا ارادہ کرے گا یا کسی مُردے کو زندہ کرنا چاہے گا تو نیابتِ الٰہی کے تحت اس کا اختیار حرکت میں آئے گا۔ اور صفت کا مظہر اس ذی رُوح کی شکل و صورت اختیار کرے گا جس کو وجود میں لانا مقصود ہے یا وہ دیکھے گا کہ اس کی رُوح سے اسم رحیم کی صفت رُوح بن کر اس مُردے میں منتقل ہو رہی ہے جس کو وہ زندہ کرنا چاہتا ہے۔

سرکشن پرشاد کی حاضری

مہاراجہ سرکشن پرشاد حیدر آباد دکن کے طبقۂ اُمرا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم بھی رہے۔ مہاراجہ شعر و سخن کے علاوہ تصنیف و تالیف میں بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ مہاراجہ کے سفر نامے اُردو زبان کے معیاری سفر ناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سرکشن پرشاد کے مطبوعہ سفر ناموں میں "سیرِ ناگ پور" نامی ایک مختصر سفرنامہ ہے۔ اس سفر نامے میں بابا تاج الدین ناگ پوریؒ کا تذکرہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی سفر نامے کے اہم مندرجات پیش کر رہے ہیں:

"تین مہینے ہوئے میرے عزیز باتمیز سیّد معین الدین خاں نبیرۂ سردار عبد الحق، دلیر الملک مرحوم نے مجھ سے بر سبیلِ تذکرہ کہا تھا کہ ناگپور کے پرے واکی اسٹیشن کے قریب ایک بزرگ تاج الدین شاہ ولی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت کامل اور مستجاب الدعوات ہیں۔ ان کی رطب اللسانی کا تخم میرے دل میں بویا گیا اور شوق و ذوقِ دید درشن کی آبیاری سے اس کی پرورش شروع ہوئی۔ کم سنی سے مجھے بزرگوں کے ساتھ بلا قید ملت و مذہب ایک خاص قسم کی عقیدت ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ میری گھٹی میں عقیدت کا پُٹ پڑا ہے۔ اگرچہ انہی دنوں میں طائرِ ارادہ کو تحریک ہوئی کہ چل کر درشن کروں، لیکن كُلُّ اَمْرٍ مَّرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهَا کے سبب پر پرواز شکستہ تھے۔ اس لئے یہ بات اور ارادہ رفت و گزشت ہو گیا۔ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ کسی سبب کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا تیسرا لڑکا عثمان پرشاد عدم برونِ دنداں کے باعث علیل ہو گیا تھا، اس میں طوالت پیدا ہوئی اور بخار لازمی ہو گیا۔ ایک سو اور ایک سو دو کے درمیان اس کا اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔"

ماہر ڈاکٹر شرول اور نامی گرامی اطبا، کا علاج ہوتا، لیکن بچے کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لوگوں کے مشورے پر سرکشن پرشاد بچے، اس کی والدہ اور بہن کو ساتھ لے کر وقار آباد چلے گئے تاکہ تبدیلِ آب و ہوا سے بچے کی طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے۔ وقار آباد کا فاصلہ حیدر آباد سے بذریعہ ریل دو گھنٹے کا تھا۔ اس دوران مہاراجہ کی لڑکی کی شادی بھی تھی۔ وقار آباد میں بھی بچے کی طبیعت میں افاقہ نہیں ہوا بلکہ بگڑ گئی۔ شادی کی مجبوری سے مہاراجہ حیدر آباد واپس آئے اور ۷۔ جمادی الآخر کو منگنی کی رسم ادا کی۔

اسی رات دو بجے بچے کی طبیعت مزید خراب ہوئی اور دوسری صبح بہت بگڑ گئی۔ مہاراجہ سخت پریشان ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے پیارے کی حالت یہاں رہ کر دیکھوں۔ فوراً ریل کے سیلون کا انتظام کر کے میں نے اپنے والد ماجد کو لکھ دیا کہ فی الحال شادی ملتوی کر دی جائے۔ ہفتہ عشرہ کے لئے میں بغرضِ تبدیلِ آب و ہوا جاتا ہوں ورنہ میری صحت پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ۸۔ تاریخ روز پنجشنبہ وقت مغرب سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے بحالتِ اضطرار روانہ ہوا اور برخوردار کی والدہ سے کہہ دیا کہ خدا پر نظر رکھ کر دُعا کرتی رہیں۔ انشاء اللہ جب بخار میں کمی محسوس ہو گی اس وقت واپس ہوں گا۔"

چلتے وقت بعض احباب نے مشورہ دیا کہ جب سفر پر روانہ ہو ہی رہے ہیں تو بہتر ہے کہ ناگپور کی طرف جا کر حضرت تاج الدین باباؒ کے بھی درشن کر لیں۔ یہ بات مہاراجہ کے دل کو لگی اور وہ ناگ پور کی سمت روانہ ہوئے۔

ناگ پور پہنچ کر راجہ صاحب کو پتہ چلا کہ بابا تاج الدینؒ راجہ رگھوجی کے مکان میں رہتے ہیں۔ راجہ صاحبؒ نے بغیر تعارف اور اجازت کے وہاں جانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اپنے منصب دار مرزا احمد بیگ کو بابا صاحب کی خدمت میں سلام پہنچانے کا حکم دیا۔ مرزا احمد بیگ جس وقت بابا صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے، بابا صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ موقع مناسب دیکھ کر مرزا احمد نے مہاراجہ کا سلام پہنچایا۔ بابا صاحبؒ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"چراغ رکھ کر چراغ کی فکر کرتا ہے۔ کہہ دے گھر کو چلا جائے۔"

مہاراجہ کشن پرشاد کو جب یہ جواب سنایا گیا تو انہوں نے اسے اپنے لئے ایک خوشخبری سمجھا لیکن ایک بات ان کے دل کے گوشے میں کھٹک رہی تھی کہ بابا صاحب مجذوبانہ طبیعت رکھتے ہیں، اس اشارے سے ان کا کوئی اور مطلب تو نہیں۔

دوسرے دن صبح گھر سے تار آیا کہ رات کو بچے کی حالت زیادہ خراب تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد بے چین ہو گئے اور ایک مصاحب رام چندر پرشاد سے کہا کہ آج کسی نہ کسی طرح بابا تاج الدینؒ کے درشن سے فیض حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا کوئی موٹر خواہ کرائے کی ہو حاصل کرو۔

تھوڑی کوشش کے بعد موٹر مل گئی۔ چار بجے لباس تبدیل کر کے اپنے دو مصاحبوں کو ساتھ لے کر ہوا خوری کے لئے نکلے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک گیا اور دیکھا ناگ پور کی بستی کو خوشنما پایا۔ سڑکیں سینۂ بے کینہ کی طرح صاف، اس کے دو رویہ گھنے درخت مسافر اور رہ گزر پر سایہ ڈالتے ہیں، مکانات کی باقاعدہ بجلی قطار، راستے وسیع۔"

چلتے چلتے راجہ کے اس باغ تک پہنچے جہاں بابا صاحب مقیم تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بابا صاحب موجود ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد فوراً موٹر سے اُتر کر اندر داخل ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دیکھتا کیا ہوں کہ زائرین کا تانتا بندھا ہوا ہے اور منتظر فضل باری ہیں۔ اور مجذوب کے مظہر کو اپنا قاضی الحاجات سمجھ کر امید کا دامن پھیلائے ہوئے ہیں۔ اور مظہر ذات نامتناہی عبودیت کے خلعت سے مزین ہو کر مجذوب کی تصویر بن کر ہر ایک کے

درد کی دوا کرنے میں اپنی مسیحائی دکھا رہا ہے۔ جَلَّ جَلَالُہٗ، عَمَّ نَوَالُہٗ۔ اس وقت بابا صاحب دوسری طرف متوجہ تھے۔ میرے پسِ پشت جاکر کھڑے ہوتے ہی چونک کر فوراً میری طرف دیکھ کر نظر ملائی۔ نظر کا ملنا تھا کہ میرے قلب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔ درحقیقت ان کی نسبت نہایت قوی اور نظر میں برقی قوت تھی۔ میں نے بھی ان کی دید سے نظر نہیں چرائی۔ دس منٹ یا اس سے کچھ زائد عرصہ گزرا ہوگا بقول شخصے

دید تو مغز است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

اس دید بازی کے مزے خوب ملے۔ اس کے بعد بابا صاحب نے کہا: "شرارتیں کرتے ہو۔ جاؤ سیدھے گھر جاؤ۔"

میں سلام کرکے واپس ہوا۔ اگرچہ تجسس کا خیال ہوا کہ میں ان سے کچھ کہوں۔ مگر ان کی زبردست نسبت نے مجھے ہر طرح مطمئن کر دیا تھا۔ جب تھوڑی دور تک میں چلا تو میرے پیچھے ہی آئے اور ایک مائی صاحبہ بیٹھی تھیں ان سے چوڑی لی اور مجھے دے کر کہا: "لو، بس اب تو جاؤ گے۔" میں نے چوڑی لی اور اس کا تفاؤل بھی نیک خیال میں آیا۔ میں پھر سلام کرکے واپس ہوا۔ میرے ساتھ آئے، میں کھڑا ہوگیا۔ وہاں کبوتر اڑ رہے تھے۔ ان کی طرف مخاطب ہوکر درختوں کے گملوں میں سے کچھ مٹی اٹھائی اور کبوتروں کی طرف ڈال کے خدا جانے کیا فرماتے رہے۔ میں تو ان کی دید میں محو تھا۔ اس اثنا میں ایک معتقد سگریٹ روشن کرکے بابا صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ نے فوراً میری طرف دکھا کر اس سے کہا: "یہ تو ان کو دو۔ یہ پئیں گے۔ ان کے واسطے۔" اور وہ سگریٹ مجھ کو عنایت

فرمایا۔ میں نے اس کو بھی لے لیا۔ جب میں جانے لگا تو جیسے فوجی سلام کرتے ہیں اس طرح سلام کرکے یہ الفاظ کہے "ALL RIGHT AND GOOD MORNING" یعنی سب کچھ بہتر ہے۔ صِبْغَۃَ اللّٰہ۔ اس سے بہتر اور تفاؤل نیک اور جامع کیا ہوسکتا تھا۔ میں پھر سلام کرکے رخصت ہوا۔ پھر میرے ساتھ ساتھ وہاں تک آئے جہاں میں موٹر سے اترا تھا۔ وہاں سے وہ دوسری طرف چلے گئے اور میں خدا حافظ کہہ کر اپنی فرودگاہ کی طرف روانہ ہوا۔"

آخر میں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنا سفرنامۂ ناگ پور اس بیان پر ختم کر دیا ہے۔

"اُدھر زلفِ یار نے کمر تک رسائی کی اور اِدھر نصف شب نے سیاہ چادر کمر تک تان لی۔ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا کے حکم کے مطابق بستر پر دراز ہوا۔ دوسرے روز منماڑ پہنچا۔ وہاں بذریعۂ تار اطلاع ہوئی کہ برخوردار کا مزاج روبہ اصلاح ہے ڈاکٹر ہنٹ نے کہہ دیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ٹمپریچر ایک سو ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ الحمد للہ المنۃ۔ اس نویدِ مسرت آمیز کے سننے سے دلِ شاد باغ باغ ہوا۔ وہاں سے سیلون بدل دیا گیا۔ میٹر گیج لائن کا ایک سیلون لے کر اورنگ آباد کے راستے سے چہارشنبہ کے روز چار بجے کی ٹرین میں الوال میں داخل ہوا اور وہاں سے بذریعۂ موٹر مکان میں آیا۔ اور سب کو خیر و عافیت کے ساتھ پایا۔ سجدۂ شکر بجا لایا اور شادی کے آغاز کے لئے حکم دے دیا۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ ہر بات کا انجام بخیر کرے۔"

سفرنامہ کی تاریخ کے متعلق پتہ چلا کہ غرۂ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ کو ۸ مئی ۱۹۱۳ء اور روز پنجشنبہ تھا۔ مہاراجہ کے بیان کے مطابق ۷ تاریخ کو منگنی ہوئی؛ ۸ تاریخ روز پنجشنبہ کو بچے کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اسی روز مہاراجہ حالتِ اضطرار میں ناگ پور کی

طرف نکل گئے۔ واپسی چہارشنبہ کو عمل میں آئی۔ اس طرح یہ ثابت ہوا کہ ۸۔ جمادی الاخرٰی ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۵۔ مئی ۱۹۱۳ء روز پنجشنبہ کو آغاز سفر کیا اور ساتویں روز ۱۴۔ جمادی الاخرٰی مطابق ۲۱۔ مئی کو حیدر آباد واپس آئے۔ اس لحاظ سے یہ سفر سات دن کا ہوتا ہے

مہاراجہ کشن پرشاد دوسری دفعہ بابا صاحب کی خدمت میں آئے تو نظام دکن کا ایک فرمان بھی ساتھ لائے جس میں کچھ جاگیر نظام نے بابا صاحب کی نذر کی تھی۔ بابا صاحب نے فرمان چاک کرتے ہوئے کہا،

"نظام دکن کا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ زمین کے مالک کو زمین نذر کرتا ہے۔ اس سے کہو کہ ہم نے تم کو زمین دے رکھی ہے۔"

لڈو اور اولاد

ایک بار دو ہندو عورتیں، مراؤلی سے بابا تاج الدین کے پاس آئیں۔ ان دونوں عورتوں کی شادی کو بارہ چودہ سال گزر گئے تھے لیکن اولاد سے محروم تھیں۔ بابا صاحب ندی کے پاس ریت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک جھولی میں سے دو لڈو نکالے اور پھینک کر ان عورتوں کو دیتے ہوئے کہا "کھالو!" ایک عورت نے لڈو کھا لیا لیکن دوسری نے نظر بچا کر ریت میں دبا دیا۔ دوسرے دن یہ عورتیں اپنے گھر چلی گئیں۔ وقتِ مقررہ کے بعد وہ عورت جس نے لڈو کھایا تھا ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔ لیکن دوسری جس نے لڈو ریت میں دبا دیا تھا، اولاد سے محروم رہی۔ اسے سخت افسوس اور پشیمانی ہوئی۔ بچے کی پیدائش کے دو ماہ بعد صاحبِ اولاد عورت بچے کو ساتھ لے کر بابا صاحب کی خدمت میں روانہ ہوئی تاکہ ناگ پور میں بال اُتارنے کی رسم انجام دے۔ اس نے اپنی سہیلی کو بھی جو اولاد سے محروم رہی تھی ساتھ لیا اور کہا، "فکر نہ کر۔ بابا حضور سے

دوبارہ کہیں گے۔ بھگوان نے چاہا تو تیرے آنگن میں بھی بہار آئے گی۔" سہیلی دل میں روتی اور افسوس کرتی مجبوراً ساتھ ہولی۔ جب یہ دونوں بابا صاحب کے پاس پہنچیں تو عجیب بات دیکھی کہ بابا صاحب ندی کے کنارے اسی مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ان کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی تھی۔ بامراد عورت نے اپنا بچہ بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دوسری عورت تاب نہ لا سکی۔ روتی ہوئی بابا صاحب کے قدموں پر گری اور کہا "بابا جی، میرا بچہ؟" بابا صاحب نے جواب دیا "ریت میں ہے۔ نکال لے۔" لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو حال پوچھا۔ عورت نے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ جب تک بابا صاحب مجھے آشیرواد دے کر روانہ نہ کریں گے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تیسرے روز بابا صاحب نے اس عورت کو دُعا سے نواز کر روانہ کیا اور وہ بھی صاحبِ اولاد ہوئی۔

سزائے موت

عبدالحسن صاحب، فرد مرچنٹ بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ نیاز کی غرض سے بابا تاج الدین کی خدمت میں واکی گئے۔ ابھی کھانا پکانے کا سامان ہو رہا تھا کہ بادل چھا گئے۔ جلدی جلدی چاول دیگ میں ڈالے ہی جا رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ دیگوں کے نیچے کی آگ بجھ گئی اور ایندھن کی لکڑیاں بہ گئیں۔ وہاں موجود لوگوں نے ہمارا مذاق اڑانا شروع کر دیا کہ ان کی نیت ہی خراب تھی جب ہی لکڑی وغیرہ بہ گئی۔ ہم لوگ شرمندہ ہوئے اور ارادہ کیا کہ جب بارش رُک جائے گی تو دوسری دیگ چڑھائیں گے۔ اتنے میں ایک قیدی جس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں، دو تین کانسٹبلوں کے ہمراہ بابا صاحب کے پاس آیا۔ اس نے بابا صاحب سے عرض کیا: عدالت نے مجھے پھانسی کی سزا سنادی ہے اور میں

اجازت دے کر آپ کے درشن کے لئے آیا ہوں۔ مجھے آشیرواد دیجئے کہ میری مکتی ہو جائے۔
باباصاحب نے فرمایا۔ "جا رے، الٹے ہاتھ سے سلام کرکے آ، بری ہو جائے گا۔" یہ
کہہ کر باباصاحب نے میرے والد صاحب سے کہا: "ان کو نیاز کا کھانا کھلاؤ۔" ہم نے اٹھ کر
دیگ کھولی تو کیا دیکھتے ہیں کہ کھانا پکا پکایا تیار ہے، حالانکہ اس کے نیچے کوئی
آگ نہیں تھی۔ اور اس وقت بھی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہم نے بشمول قیدی تمام حاضرین کو
کھانا کھلایا۔ میرے والد نے قیدی سے پوچھا کہ تمہیں کس بات پر سزا ہوئی ہے۔ اس
نے بتایا کہ میں نے اپنے ملازم کو اپنی لڑکی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر چاہا
کہ دونوں کو قتل کر دوں لیکن لڑکی فرار ہوگئی اور ملازم میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اب
مجھے یقین ہے کہ اپیل کروں گا تو بری ہو جاؤں گا کیوں کہ باباصاحب نے اپیل کرنے کا
اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپیل کی اور موت کی سزا سے بری ہو گیا۔

دست گیر

بمبئی کی ایک طوائف بیان کرتی ہیں:
جب سے میں نے حضور باباصاحب کا تذکرہ سنا اور آپ
کی غربا پروری، خطاکاروں کی پردہ داری اور ان پر شفقت و محبت کے واقعات سنے
مجھے باباصاحب سے دلی تعلق ہو گیا۔ اور میں نے خود کو باباصاحب کے ارادتمندوں
میں شمار کرنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ میں اپنی خطاکاریوں کے باعث آتشک میں مبتلا
ہو گئی۔ میری حالت اتنی خراب ہو گئی کہ میں نے خود کو بالاخانے سے گرا کر جان دینے کا
ارادہ کر لیا۔ یہ فیصلہ کر کے میں بستر سے اٹھی اور بالاخانے کی طرف چلی۔ چلتے ہوئے میری
نظر دیوار پر لگی ہوئی حضور باباصاحب کی تصویر پر پڑی۔ شبیہ مبارک کو دیکھ کر میں بے
اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور باباصاحب کو مخاطب کیا: "اے کاش! میں آپ کی

خدمت میں حاضر ہو جاتی تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔ اور مجھ سے ایسے قبیح افعال سرزد
نہ ہوتے۔" میں رو رو کر باباصاحب سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ یکایک
محسوس ہوا کہ کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑا اور بستر کی جانب لے کر چلا۔ میں بے اختیار اس
قوت کے زیرِ اثر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا اور میں نے دیکھا
کہ حضور باباصاحب تشریف لائے۔ اپنی انگشتِ شہادت سے لعابِ دہن لگایا۔
پھوڑا پھٹ گیا اور مواد خارج ہونے لگا۔ میری آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ واقعی مواد بہ رہا
ہے۔ اس کے بعد سے اس مرض کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور میں نے گناہ آلود زندگی سے توبہ
کر لی۔ اب ہر وقت باباصاحب کا تصور میرے ساتھ رہتا ہے اور مجھے باباصاحب کے
تعلق سے ایسا دلی اطمینان نصیب ہوا ہے جس کا لطف بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔

دُو تھال میں سارا ہے

سید عبدالرحمٰن صاحب جو سی۔ پی گورنمنٹ کے
فارسٹ کنٹریکٹر تھے، روایت کرتے ہیں کہ ایک
دفعہ میں بابا تاج الدینؒ کے پاس موجود تھا کہ ایک چور باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر
ہوا اور ایک طرف بیٹھ کر دل ہی دل میں باباصاحبؒ سے مخاطب ہوا کہ حضور! مجھ
سے چوری کا ارتکاب ہوا ہے اور میں نے ایک حلوائی کے ہاں چوری کی ہے۔ میں اس
فعل پر سخت نادم ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ میری پردہ داری کرتے ہوئے مجھے سزا
سے بچا لیجئے۔ اس خاموش عرض کے جواب میں باباصاحبؒ نے اس کی طرف رُخ کر کے
کہا: "بھاگ جا۔ تیرا کام ہو گیا۔"
اتنے میں وہ حلوائی بھی جس کے ہاں چوری ہوئی تھی، حاضرِ دربار ہوا۔ اور فریاد
کی کہ حضور! میں لٹ گیا۔ میری تمام کمائی کسی نے چرالی۔ باباصاحبؒ نے ارشاد

فرمایا: "ارے جا، دو تھال میں سارا ہے۔ اس کا کام بھی ہو گیا، تیرا بھی ہو جاتا۔ جا اور دکان کھول۔"

حلوائی واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ سارا مال اور پونجی تو چوری ہو چکی لیکن دو تھال چرونجی والے سے بھرے بچ گئے ہیں۔ اسے باباصاحبؒ کا ارشاد یاد تھا کہ دو تھال میں سارا ہے۔ اس نے مکمل یقین کے ساتھ ان دو تھالوں سے کاروبار دوبارہ شروع کیا۔ حالات بہت تیزی سے اس کے حق میں سازگار ہوتے گئے یہاں تک کہ پہلے سے زیادہ معاشی فراخی حاصل ہو گئی۔

بدکردار لڑکا

گوندیا صاحب میونسپل میں محرر تھے۔ ان کا بیٹا اندر بدکرداری اور کج روی کے باعث جالندھر کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور مرض کی پیچیدگی روز بروز اتنی بڑھی کہ علاج کی امید دم توڑنے لگی۔ اس ابتر حالت میں گوندیا صاحب اپنے لڑکے کو شکر درہ باباصاحبؒ کی خدمت میں لائے۔ دو دن تک باباصاحبؒ نے کوئی توجہ نہ دی لیکن تیسرے دن اچانک اٹھے اور لڑکے کے پاس جا بیٹھے۔ بیٹھنے کے بعد چائے طلب کی اور ایک دو گھونٹ پی کر مریض اندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "لے چائے پی لے۔"

مرض کی شدت سے لڑکا اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے چائے کی پیشکش پر کوئی جواب نہیں دیا۔ باباصاحبؒ نے دوبارہ کہا: "چائے پی لے۔"

اندر نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ باباصاحبؒ نے جلال میں چائے کا گلاس اندر کے منہ سے لگا دیا۔ بےحس و حرکت اور بےہوش اندر نے ہونٹ کھول دیئے اور چائے حلق سے اترتی چلی گئی۔ لگتا تھا کہ چائے نہیں، آبِ

حیات اس کے حلق میں جا رہا ہے۔ چائے پینے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا اور ایک ہفتہ میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

اجمیر یہیں ہے

ایک صاحب نے باباتاج الدینؒ سے درخواست کی: "حضور! میں اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں۔"

باباصاحبؒ نے فرمایا: "اجمیر یہیں ہے، کہاں جاتا ہے!" یہ کہہ کر باباجانؒ نے اُن صاحب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ صاحب اپنے ماحول سے بےخبر ہو گئے اور دیکھا کہ اجمیر شریف کی سیر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد باباصاحبؒ نے ان کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو انہوں نے خود کو باباصاحبؒ کی خدمت میں موجود پایا۔

اس کرامت کی توجیہ قلندر بابا اولیاءؒ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے:

انسان کی ذات کا ایک حصہ داخلی ہے اور دوسرا خارجی۔ داخلی حصہ اصل ہے اور خارجی حصہ اس ہی اصل کا سایہ ہے۔ داخلی حصہ میں زمان و مکان دونوں نہیں ہوتے لیکن خارجی حصہ میں زمان و مکان دونوں ہوتے ہیں۔ داخلی حصہ میں ہر چیز جزو لاتجزیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی مکانیت کا احاطہ نہیں کرتی۔ صرف مشاہدہ ہوتی ہے۔ مکانیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر زمانیت بھی نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ہم کسی عمارت کی ایک سمت میں کھڑے ہو کر اس عمارت کے ایک زاویہ کو دیکھتے ہیں۔ جب اس عمارت کے دوسرے زاویہ کو دیکھنا ہوتا ہے تو چند قدم چل کے اور کچھ فاصلہ طے کر کے ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے عمارت کے دوسرے رُخ پر نظر پڑتی ہے۔ نگاہ کا زاویہ تبدیل کرنے میں چند قدم کا فاصلہ

طے کرنا پڑا اور فاصلہ طے کرنے میں تھوڑا سا وقفہ بھی صرف ہوا۔ اس طرح نظر کا ایک زاویہ بنانے کے لئے مکانیت اور زمانیت دونوں وقوع میں آئیں۔ ذرا وضاحت سے اس بات کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جب ایک شخص لندن ٹاور کو دیکھنا چاہے تو کراچی سے سفر کر کے اس کو لندن پہنچنا پڑے گا۔ ایسا کرنے میں اس کو ہزاروں میل کی مکانیت اور کئی دنوں کا زمانہ لگانا پڑا۔ اب نگاہ کا وہ زاویہ بنا جس سے لندن ٹاور دیکھا جا سکتا ہے۔ مقصد صرف نگاہ کا وہ زاویہ بنانا تھا جو لندن ٹاور کو دکھا سکے۔ یہ انسان کی ذات کے خارجی حصہ کا زاویۂ نگاہ ہے۔

اس زاویہ میں مکانیت اور زمانیت استعمال ہونے سے کثرت پیدا ہو گئی۔ اگر ذات کے داخلی زاویۂ نگاہ سے کام لینا ہو تو ہم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذہن میں لندن ٹاور کا تصور کر سکتے ہیں۔ تصور کرنے میں جو نگاہ استعمال ہوتی ہے وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے ایک دھندلا سا خاکہ دکھاتی ہے لیکن وہ زاویہ ضرور بنا دیتی ہے جو ایک طویل سفر کر کے لندن ٹاور تک پہنچنے کے بعد ٹاور کو دیکھنے میں بنتا ہے۔ اگر کسی طرح نگاہ کی ناتوانی دور ہو جائے تو زاویۂ نگاہ کا دھندلا خاکہ روشن اور واضح نظارے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ اور دیکھنے کا مقصد بالکل اس ہی طرح پورا ہو جائے گا جو سفر کی جدوجہد اور سفر کے بہت سے وسائل استعمال کرنے کے بعد پورا ہوتا ہے۔

بابا تاج الدین اولیاءؒ نے تصرف کے ذریعے سائل کی نظر میں وہ زاویہ پیدا کر دیا جو اجمیر شریف کے نظارے کے لئے درکار تھا اور اس نے اجمیر شریف کی سیر بالکل اسی طرح کر لی جیسے وہ وہاں موجود ہو۔

یہ اچھا پڑھے گا

مسٹر ڈی ایس سوم سندرم کہتے ہیں کہ جن دنوں ہم شکر درہ میں مقیم تھے، میری لڑکی باباصاحبؒ کی خدمت میں جاتی تو اس کا بیٹا مدن گوپال بھی ساتھ ہوتا تھا۔ مدن گوپال بات بات پر ضد کرتا تھا۔ ایک دن باباصاحبؒ نے مدن سے کہا: "کیوں رے! ماں کو ستاتا"! یہ کہہ کر ایک کتاب مدن گوپال کو دی اور کہا: "یہ پڑھو!" پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: "یہ اچھا پڑھے گا"۔

باباصاحبؒ کی بشارت پوری ہوئی۔ مدن گوپال نے ایم بی بی ایس کی ڈگری لینے کے بعد برطانیہ سے امراضِ چشم کی سرجری کی اعلیٰ ڈگریاں لیں۔

بارش میں آگ

ایک دفعہ سخت خشک سالی ہو گئی۔ پانی کی کمی سے فصلیں متاثر ہونے لگیں اور چارے کی کم یابی سے مویشی مرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے بابا تاج الدینؒ سے کہا: "باباجی! بارش نہ ہونے سے اناج مہنگا ہو گیا ہے۔ اور عوام کو سخت پریشانی کا سامنا ہے۔" باباصاحبؒ یہ سن کر مسکرائے اور جنگل کی طرف چل دیئے۔ لوگ ساتھ ہو لئے۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو وہاں کے کسانوں نے باباصاحبؒ سے کہا: "باباصاحب! خشک سالی سے ہماری فصلیں تباہ ہو رہی ہیں اور مویشی مر رہے ہیں۔"

یہ سُن کر باباصاحبؒ کی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ جلال میں آکر پانی طلب کیا۔ ایک کسان نے لوٹے میں پانی بھر کر پیش کیا۔ باباصاحبؒ نے لکڑیاں جمع کرا کے آگ جلائی اور لوٹے کی ٹونٹی سے تھوڑا تھوڑا پانی آگ پر ڈالنا شروع کیا۔ پانی کے قطرے سلگتی لکڑیوں پر گرتے اور لمحہ بھر میں بھاپ بن کر اُوپر کا رُخ کرتے۔ جوں جوں یہ آبی بخارات اُوپر جا رہے تھے لوگوں نے دیکھا کہ آسمان ابر آلود ہوتا جا رہا تھا۔ لوٹے

کا پانی ختم ہوتے ہی آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور کچھ ہی دیر بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔

چھوت چھات

دربار تاج الاولیاء کے حاضر باش لوگوں، عقیدت مندوں اور زائرین کا معمول تھا کہ وہ مختلف قسم کے کھانے پکا کر بابا صاحبؒ کو پیش کرتے۔ بابا صاحبؒ کسی میں سے کچھ کھا لیتے۔ باقی کھانا وہاں موجود لوگ کھاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن گزر جاتے لیکن ایک لقمہ بھی بابا صاحبؒ کے حلق سے نہ اترتا۔ کھانا پکا کر پیش کرنے والوں میں بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ، عالم، رؤسا اور نواب تک شامل تھے۔

ایک مہترانی (ہندو خاکروب عورت) کی دلی تمنا تھی کہ وہ بھی کچھ پکا کر بابا صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرے۔ ایک عرصہ سے یہ خواہش اس کے دل میں مچل رہی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ بابا صاحبؒ کے حضور کھانا پیش کرنے والوں میں بڑے بڑے امراء اور اونچی ذات کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھ نیچ ذات کو کون پوچھے گا۔ پتہ نہیں لوگ یہ کھانا پیش کرنے کی اجازت دیں گے بھی یا نہیں۔ خلوص کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن وہ اپنی بساط کے مطابق کھانا پکا کر لے گئی لیکن نیچ ذات ہونے کے خیال نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم پھر روک دیئے۔ خوف کے مارے اس نے اپنا کھانا ایک امرود کے درخت سے باندھ دیا۔

بابا تاج الدینؒ راجہ رگھوجی کے محل میں موجود تھے۔ کھانے کے وقت انہوں نے کھانا طلب کیا۔ حاضرین نے اپنے اپنے توشے دان کھول کر پیش کئے۔ بابا صاحبؒ نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ فرمایا: "یہ نہیں کھاتے۔ وہ کھانا لاؤ جو درخت سے بندھا ہے۔"

کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کون سا کھانا ہے جو درخت سے بندھا ہے۔ حاضرین ادھر ادھر دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مہترانی دور جا کر ایک جگہ بیٹھ گئی اور وہاں سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ لوگوں نے بارہا کوشش کی کہ بابا صاحبؒ کسی توشہ دان سے کھانا کھا لیں لیکن بابا صاحبؒ نے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ برابر یہی کہہ رہے تھے کہ وہ کھانا لاؤ جو درخت سے بندھا ہے۔ کچھ دیر بعد بابا صاحبؒ خود اٹھے اور محل سے باہر اسی امرود کے درخت کے پاس پہنچے جس سے مہترانی کا کھانا بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے توشہ دان اتار کر کھولا اور وہیں بیٹھ کر کھایا۔

لوگ یہ معلوم کرنے میں لگ گئے کہ توشے دان کا مالک کون ہے۔ آخر مہترانی نے جا کر سارا معاملہ بتایا۔ اور خود فرطِ خوشی سے جھومنے لگی۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔

مناسک حج

ایک ضعیف العمر صاحب مدراس سے بابا صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا "حضور! آپ کے پاس راجہ، نواب، اور صاحب حیثیت لوگ بھی آتے ہیں۔ کسی سے اتنی رقم دلوا دیجئے کہ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر لوں۔ یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے۔"

بابا صاحبؒ نے انہیں اطمینان دلایا۔ دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ حج پر جانے کا وقت قریب آ گیا۔ ان صاحب نے دوبارہ عرض کیا۔ بابا صاحبؒ خاموش رہے۔ اسی خاموشی میں حج پر جانے کا وقت بھی گزر گیا۔ یہ صاحب نہایت مضطرب اور بے چین حج سے ایک روز پہلے بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا "حضور! کل سے حج شروع ہو جائے گا لیکن آپ نے حج پر جانے میں میری کوئی مدد نہیں کی۔"

اگلے دن باباصاحبؒ حسبِ معمول باہر نکلے تو ان صاحب نے دوبارہ اپنی بے چینی اور محرومی کا ذکر کیا۔ باباصاحبؒ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کچھ دُور لے جا کر ایک جگہ پر بٹھا دیا۔ بیٹھے بیٹھے ان صاحب کی پلکیں بوجھل ہوگئیں اور وہ وہیں لیٹ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مکہ میں موجود ہیں اور حاجیوں کے ساتھ مناسکِ حج ادا کر رہے ہیں۔ وہیں پڑے پڑے انہوں نے تمام مناسکِ حج ادا کرتے خود کو دیکھا۔ حج کا وقت ختم ہوا تو باباصاحبؒ وہاں پہنچے اور ان سے کہا: "کیا یہیں پڑا رہے گا؟"

ضعیف العمر صاحب کے پپوٹوں میں حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کر مستانہ وار باباصاحبؒ کے ساتھ ہو لئے۔ یہ ضعیف العمر مدراسی صاحب بعد میں "نانا" کے نام سے مشہور ہوئے اور آخر وقت تک تاج آباد میں رہے۔

اس کرامت کے اصول کو سمجھنے کے لئے ہمیں خواب اور بیداری کا مختصر جائزہ لینا ہوگا۔ ہم اپنی پوری زندگی دو حواس میں گزارتے ہیں۔ ایک خواب، دوسرے بیداری۔ خواب اور بیداری، ہماری زندگی دو حالتوں میں سفر کرتی رہتی ہے۔ فرق صرف حواس کی نوعیت میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

"اللہ رات (خواب) کو داخل کرتا ہے دن (بیداری) میں اور دن کو داخل کرتا ہے رات میں، زندگی کو موت سے نکالتا ہے اور موت کو زندگی سے نکالتا ہے۔"

رات کے حواس میں مکانی اور زمانی فاصلے مردہ ہو جاتے ہیں لیکن دن کے حواس میں یہی فاصلے زندہ ہو جاتے ہیں۔

زید خواب دیکھتا ہے کہ وہ اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہا ہے حالانکہ اس کا دوست دور دراز فاصلے پر رہتا ہے۔ خواب میں زید کو یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ اس کے اور دوست کے درمیان کوئی فصل ہے۔ ایسے خواب میں مکانی فاصلے صفر ہوتے ہیں۔ اسی طرح زید گھڑی دیکھ کر رات کے ایک بجے سوتا ہے۔ خواب میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہفتوں اور مہینوں کے فاصلہ کا سفر کرتا ہے، راستے میں اور منزل پر قیام بھی کرتا ہے، ایک طویل مدت گزارنے کے بعد گھر واپس آتا ہے، آنکھ کھلتے ہی گھڑی دیکھتا ہے ـــ اب بھی ایک ہی بجا ہے۔ اس قسم کے خواب میں زمانی فاصلہ صفر ہوتا ہے۔ رات کے حواس میں جو فاصلے مُردہ ہو جاتے ہیں، وہی فاصلے دن کے حواس میں زندہ ہو جاتے ہیں۔

بیداری ہو یا خواب دونوں حالتوں میں ہمارے اعمال مشترک ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا کام ہے جو ہم بیداری میں کرتے ہوں اور خواب میں نہ کرتے ہوں فرق صرف حواس کی نوعیت کا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم خواب کی حالت میں بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی طرح ہم خواب کے حواس کو استعمال کرنا سیکھ جائیں جیسا کہ ہم بیداری کے حواس کو استعمال کرنا جانتے ہیں تو ہم زمان و مکان سے آزاد ہو کر حسبِ منشار کام انجام دے سکتے ہیں۔ انبیائے کرام کے اندر یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خواب اور بیداری میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انبیاء سوتے ہیں لیکن ان کا قلب جاگتا رہتا ہے۔

جب حج کے متمنّی شخص نے ضد کی تو باباصاحبؒ نے تصرّف کے ذریعے اس کی

سیداری کی حالت کو خواب میں منتقل کر دیا اور جسم خاکی کے ساتھ وہاں موجود ہونے کے باوجود زمان و مکان سے آزاد ہو کر مناسک حج پورے کئے۔

ایک آدمی، دو جسم ___؟

مدراس کے رہنے والے ایک برہمن کسی آفس میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے آفس سے چار روز کی چھٹی لی اور بابا تاج الدینؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ جب رخصت کی میعاد ختم ہونے لگی تو انہوں نے بابا صاحبؒ سے واپسی کی اجازت چاہی لیکن بابا صاحبؒ نے اجازت نہیں دی۔ ایک ہفتہ بعد دوبارہ اجازت مانگی تو بھی بابا صاحبؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ماہ بعد بابا صاحبؒ نے اجازت دی تو یہ فکر و تردد میں مبتلا گھر پہنچے کہ ایک ماہ کی غیر حاضری کی وجہ سے نہ جانے گھر والوں کا کیا حال ہو اور آفس میں تو سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھر پہنچے تو نہ بیوی بچوں نے غیر معمولی جذبات کا اظہار کیا اور نہ ہی ایک ماہ کی غیر حاضری کو پوچھا۔ نہا دھو کر سفر کی تکان اتری تو بیوی سے پوچھا کہ کیا دفتر کا کوئی آدمی مجھے پوچھنے آیا تھا۔ بیوی نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ دفتر کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا لیکن آپ اتنے پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ انہوں نے سارا حال کہہ سنایا۔ اور کہا کہ عجیب بات ہے کہ نہ تم میری ایک ماہ کی غیر حاضری کا پوچھتی ہو اور نہ دفتر والوں کو میری پرواہ ہے۔ بیوی نے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ مذاق کیوں کرتے ہیں، دفتر کا وقت ہو گیا ہے، دفتر جایئے۔ دفتر میں بھی ہر شخص معمول کے مطابق پیش آتا رہا۔ کسی کا رویہ غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ صاحب سخت حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گئے اور عالمِ تصور میں بابا صاحبؒ سے مخاطب ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے، کوئی مجھ سے غیر حاضری کو نہیں پوچھتا۔ ابھی وہ اس مخمصے میں مبتلا ہی تھے کہ چپراسی نے آکر کہا کہ صاحب نے وہ فائل منگوائی ہے جو کل، ذرا بھی فائل لے کر افسر کے پاس پہنچے اور کہا کہ میں تو ایک ماہ تک شکر درہ میں بابا تاج الدینؒ کے پاس ٹھہرا رہا لیکن یہاں آکر عجیب معاملے سے دوچار ہوں۔ نہ گھر والے میری غیر حاضری کو پوچھتے ہیں اور نہ دفتر والوں کو مجھ سے شکایت ہے۔ چپراسی کا کہنا ہے کہ یہ فائل کل آپ نے مجھ کو دی ہے حالانکہ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں دفتر آیا ہی نہیں آیا۔ افسر نے حیرت سے کہا: "آپ تو چار دن کی چھٹی کے بعد دفتر آگئے تھے اور اس عرصہ میں سارے دفتری امور پوری طرح انجام دیتے رہے ہیں۔"

شکر درہ اور مدراس دونوں جگہ کی حاضری کا ثبوت ملا تو برہمن صاحب کے علاوہ سارے دفتر والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

بڑے کھلاتے اچھے ہو جاتے

اکثر ایسا ہوتا کہ بابا تاج الدینؒ جس گاؤں یا جس شہر میں رکتے، تو وہاں آپ کے اشارے پر بڑے بھیجے تقسیم کئے جاتے اور وہاں موجود کوئی شخص ان کی قیمت بڑے والے کو ادا کر دیتا۔ ایک بڑھیا بہت بیمار ہوئی اور منت مانی کہ اگر میں صحت یاب ہو جاؤں تو لوگوں میں بڑے بٹواؤں گی۔ اس کو صحت نصیب ہوئی۔ وہ اپنے گاؤں سے بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئی اور بطور نیاز عمدہ اور وافر مقدار میں کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا۔ جب گھر واپس گئی تو دوبارہ بیمار ہو گئی۔ دوبارہ بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے عرض کیا: "حضور! میں نے منت مانی اور صحت یاب ہوئی لیکن اب پھر اسی بیماری نے پکڑ لیا ہے۔"

بابا صاحبؒ نے فوراً جواب دیا: "لوگوں کو بڑے کھلاتے، اچھے ہو جاتے۔"

یہ سنکر بڑھیا کو یاد آیا کہ اس نے بڑے بانٹنے کی منّت مانی تھی۔ چنانچہ بڑھیا نے لوگوں کو بڑے کھلائے اور اس کو دوبارہ صحت حاصل ہوگئی۔

معذور لڑکی

راجہ رگھوجی راؤ کے ملازم منشی نور علی صاحب کا بیان ہے کہ ایک رات آٹھ بجے کے قریب عیسٰی خاں صاحب کھانا لے کر بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور بابا صاحبؒ سے اصرار کیا کہ کھانا کھالیں۔ بابا صاحبؒ نے جواب دیا۔ "ٹھیر رہے! میرا مہمان آیا ہے۔ اس سے مل لوں، تب کھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر بابا صاحبؒ اُٹھے، قیام گاہ سے نکل کر روانہ ہوئے۔ صدر دروازے سے نکل کر آگے بڑھے اور پُل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت پُل کی طرف آتی نظر آئی۔ یہ عورت جھانسی کی رہنے والی تھی اور اس نے اپنی لڑکی کو اٹھا رکھا تھا جو ہاتھ پیروں سے معذور تھی۔ اس نے لڑکی کو بابا صاحبؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ بابا صاحبؒ اٹھے اور لڑکی کے دوپٹے کو پکڑ کر حکم دیا۔ "اٹھو!" لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیٹھی رہی۔ دوسری بار بابا صاحبؒ نے ڈانٹ کر فرمایا۔ "اٹھ!" لڑکی نے خوف زدہ ہو کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکی، گر پڑی۔ تیسری بار جلال اور تحکم کی ملی جلی کیفیت میں کہا "اُٹھ ری!" لڑکی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بابا صاحبؒ یہ کہتے ہوئے اپنی قیام گاہ کی طرف بڑھے "میرے پیچھے میرے ساتھ چل۔" وہ لڑکی اپنے پیروں پر قیام گاہ تک گئی۔ کچھ دن تک وہ لڑکی شکر درہ میں رہی اور مکمل صحت یاب ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

کالے اور لال مُنہ کے بندر

بابا تاج الدینؒ کے فیض یافتہ حضرت محمد عبدالعزیز عرف نانا میاں صاحب کا کہنا ہے کہ میرے ایک دوست جو پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے، بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا صاحبؒ نے ان سے کہا۔ "کالے مُنہ کے بندر لال مُنہ کے بندر ہوتے۔" یہ بات میرے دوست کو بُری لگی اور دل میں سوچا کہ عجیب آدمی ہیں کہ مجھے کالے مُنہ اور لال مُنہ کے بندر کہہ رہے ہیں۔ ضرور یہ مخبوط الحواس ہیں جنہیں لوگوں نے برگزیدہ ہستی کا درجہ دے دیا ہے۔

ہیڈ کانسٹبل صاحب جب اپنے وطن رائے پور پہنچے تو وہاں کے ڈی ایس پی نے ان کو اپنا پی۔ اے مقرر کر دیا۔ اور کچھ دنوں بعد سب انسپکٹر کی ٹریننگ کے لئے ساگر بھیج دیا۔ جب یہ مجھ سے ملنے آئے تو سب انسپکٹر ہو چکے تھے اور ان کی وردی کالے رنگ سے بدل کر سُرخ رنگ کی ہوگئی تھی جو سب انسپکٹر کی وردی ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بابا صاحبؒ کا کہنا بالکل سچ نکلا۔ کالے منہ کے بندر لال منہ کے بندر ہونے کا مطلب میری ترقی کی طرف اشارہ تھا۔ یہ سنکر مجھے (راوی کو) بھی بابا صاحبؒ کی ذات پر کشش محسوس ہوئی اور میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سونا بنانے کا نسخہ

عبدالرزاق صاحب کا بیان ہے کہ میرے ماموں کو سونا گری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اور انہوں نے اس کام پر سینکڑوں روپے برباد کر دیے تھے۔ ایک دفعہ کسی صاحب کمال سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ دو سو برس پُرانے مکانوں کی دیواروں پر ایک خود رَو بوٹی اُگ آتی ہے۔ اس بوٹی کی پہچان یہ ہے کہ اس سے شنجرف کا کشتہ باوزن ہو جاتا ہے جو کہ تلنے کو رنگتا ہے۔ ماموں صاحب اپنے گاؤں سے ناگ پور آئے اور ایک پُرانے اور بوسیدہ مکان سے مطلوبہ بُوٹی کو حاصل کر لیا۔ بُوٹی حاصل کرنے کے بعد سوچا کہ

پہلے بابا تاج الدین رہ کے پاس حاضری دینی چاہئیے۔ اور ان کی دُعا کے بعد بھٹی لگانی چاہیے تاکہ کامیابی نصیب ہو۔ شکردرہ بابا صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ بابا صاحب رہ تانگے پر سوار جا رہے ہیں۔ بابا صاحب رہ کے گلے میں پھولوں کا ایک گجرا تھا۔ اس میں تُلسی کے پتّے بھی لگے ہوئے تھے۔ بابا صاحب رہ نے اُس گجرے میں سے تُلسی کا ایک پتہ نکال کر ماموں صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے برکت کے لئے بُوٹی کے مصالحے میں تُلسی کا پتہ بھی شامل کر دیا۔ اس مصالحے کو آزمایا تو شنگرف کا کشتہ ہم وزن تیار ہو گیا۔ اس یقینی آزمائش کے بعد اس بُوٹی اور تُلسی کے پتے کے سفوف کو تانبے پر استعمال کیا تو سونا تیار ہو گیا جسے بازار میں فروخت کر دیا۔ اس کے بعد ماموں صاحب نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن اس بُوٹی سے سونا تیار نہیں ہوا جس سے پہلے تیار ہو گیا تھا اور نہ پھر کبھی بابا صاحب رہ نے انہیں کوئی تُلسی وغیرہ کا پتہ دیا۔

درشن دیوتا

حضرت بابا تاج الدین رہ سے ہر مذہب و ملّت اور ہر عقیدہ کے لوگوں نے فیض پایا۔ ان کے فیض کا دریا بنجر و خشک اور زرخیز زمین دونوں کو کسی امتیاز کے بغیر سیراب کرتا تھا۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق باباؒ کی نظرِ کرم سے مستفیض ہوتا تھا۔

جناب بہادر پرشاد صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک سادھو سے ملاقات کے دوران حضور مہاراج بابا صاحبؒ کا ذکر آگیا تو انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "ہم ہندوؤں کے یہاں کس چیز کی کمی ہے جو تم ایک مسلمان فقیر کے والہ و شیدا ہو رہے ہو؟" میں نے ان سے کہا کہ آپ بابا صاحبؒ کی خدمت میں ایک بار حاضر ہو کر تو دیکھئے۔ چنانچہ میں سادھو صاحب کو لے کر شکردرہ حاضر ہوا۔ بابا صاحبؒ محل کے اندر تشریف

رکھتے تھے۔ ہم دُور کھڑے ہو کر محل کی طرف ٹکٹکی باندھ کر درشن کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے یکایک دیکھا کہ ہم جس جگہ کھڑے ہیں وہاں نہ کوئی محل ہے نہ آشرم۔ ہم کبھی ندی کے کنارے شنکر جی کا درشن کرتے ہیں، کبھی رام چندر جی کو دیکھتے ہیں۔ اور کبھی خود کو کرشن جی کے پاس دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک لمحے میں سارے اوتاروں کے درشن کر لئے۔ اتنے میں لوگوں کی آوازیں گونج اٹھیں اور ہم نے دیکھا کہ ہم شکردرہ کے محل کے سامنے کھڑے ہیں اور سامنے بابا صاحب رہ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بے اختیار بابا صاحب کے قدموں میں گر پڑے۔ اور اس کے بعد جو کچھ گزری وہ پربھو ہی جانتے ہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ تین سادھوؤں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار بابا صاحبؒ سے متعلق کیا۔ میں جب ان سے ملاقات کر کے واپس گھر آیا اور رات کو سویا تو حالتِ خواب میں دیکھا کہ بابا صاحبؒ میرے گھر تشریف لائے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی بیوی سے کہا کہ اٹھو، فوراً چائے بناؤ۔ دیکھتی نہیں ہو کہ آج بابا صاحبؒ نے ہمارے گھر تشریف لا کر ہمیں کتنی عزت بخشی ہے! میری بیوی نے چائے بنا کر پیش کی۔ بابا صاحب رہ نے چائے پی اور فرمایا: "چل رے تیرے کو تیرتھ کرا لاؤں۔"

بابا صاحبؒ کے ساتھ میں گھر سے باہر نکلا تو انہوں نے فرمایا: "ان تینوں سادھوؤں کو بھی ساتھ لے لو۔"

چنانچہ میں نے ان سادھوؤں کو بھی ساتھ لے لیا۔ آگے آگے بابا صاحبؒ تھے، درمیان میں سادھو اور پیچھے میں۔ لمحے بھر میں ہم بنارس پہنچ گئے اور درشن کے بعد گیا جی پہنچ کر وہاں بھی درشن کئے۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: "چلو، جگن ناتھ جی کا بھی درشن کر لیں۔"

ہم لوگ جگن ناتھ جی پہنچے اور درشن سے فارغ ہو کر بازار میں آئے۔ ایک سادھو نے مجھ سے کہا: "جگن ناتھ جی کی نشانی ایک لوٹا دلا دو۔"

میں نے ایک دکان پر لوٹے کی قیمت پوچھی تو دکاندار نے تین یا چار روپے بتائی۔ میں نے دکان دار سے مناسب قیمت دریافت کی تو اس نے کہا یہی مناسب قیمت ہے۔ میں نے فوراً قیمت ادا کی اور لوٹا لے کر سادھوؤں کے حوالے کر دیا۔

شام کو جب سادھوؤں کے استھان پہنچا تو وہ لوگ وہاں موجود نہیں تھے میں شکر درہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ بابا صاحبؒ کی زیارت کروں۔ میں نے وہاں محل کے صدر دروازے کے قریب ان تینوں سادھوؤں میں سے ایک کو بیٹھے دیکھا ایک طرف وہی لوٹا رکھا ہوا تھا جو میں نے جگن ناتھ جی سے خرید کر اُن کو دیا تھا۔ میں یہ لوٹا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ جگن ناتھ جی کی زیارت اور لوٹا خریدنے کا واقعہ عالمِ بیداری میں ہوا یا خواب میں۔ میں نے سادھو سے پوچھا: "آپ یہاں کس لئے آئے ہیں اور یہ لوٹا کہاں سے لائے ہیں؟"

سادھو نے مسکرا کر جواب دیا: "بہت جلد بھول گئے آپ، یہ وہی لوٹا تو ہے جو آپ نے جگن ناتھ جی میں دلایا تھا۔ میں بھی بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ ان سے مکتی (نجات) کا مارگ حاصل کروں۔"

سادھو کے منہ سے اتنا سننا تھا کہ میں بے خود ہو کر محل کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ بابا صاحبؒ میری طرف تشریف لا رہے ہیں۔ قریب آ کر فرمایا: "بڑے ساہوکار کے بیٹے! ڈھائی روپے کے لوٹے کے اتنے دام دے دیئے۔"

میں بے تاب ہو کر بابا صاحبؒ کے چرنوں میں گر پڑا۔

تحصیلدار

مہاراجہ قرولی اور تحصیل دار درگا پرشاد کے گرو خود کو حضرت بابا تاج الدین رحؒ کا داس کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوتھی میں بابا صاحبؒ کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔ اکثر پوتھی کھول کر فوٹو دیکھا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نہ مشرک ہیں اور نہ بت پرست۔ ہمیں بابا صاحبؒ نے اللہ اللہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ بس رات دن ہمارا یہی شغل ہے۔

مہاراجہ قرولی کے گرو سادھو صاحب بیان کرتے تھے: "میں برہمن ہوں۔ ایم اے اور ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد ناگ پور میں تحصیل دار مقرر ہوا۔ مجھے اپنی بیوی سے شدید محبت تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ پہلے تو میں نہیں مانا لیکن بعد میں سوچا کہ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ شادی کرنا مناسب ہے یا نہیں، شادی نہیں کروں گا۔ پنڈتوں کی بات سے مجھے قطعی اطمینان نہیں تھا۔ اس زمانے میں ناگ پور کے بچے بچے کی زبان پر بابا تاج الدینؒ کا نام تھا۔ میں ان ہندوؤں کو بُرا سمجھتا تھا جو مسلمان فقیروں کے پاس جاتے تھے۔ پھر بھی میرے دل نے کہا چلو، حاضر ہو کر دیکھ لیا جائے۔ زبان سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر کامل ہیں تو خود جواب دیں گے۔

میں نے ایک ٹوکرا کیلا خریدا اور بابا صاحبؒ کے دربار میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی میرا ان کا سامنا ہوا، بابا صاحب نے فرمایا: "آیئے تحصیل دار صاحب! تاج الدین نے بیوی نہیں کی، آپ بیوی کر کے کیا کریں گے۔" پھر فرمایا: "لاؤ کیلا کھلاؤ۔"

میں نے کیلا چھیل کر پیش کیا۔ بابا صاحب نے تھوڑا سا کھانے کے بعد میری طرف بڑھا دیا اور کہا: "کھا جاؤ۔"

میں برہمن زادہ، چھوت چھات کا سختی سے پابند۔ پھر بھی ایک مسلمان کا جھوٹا کیلا کس طرح کھا گیا، مجھے یاد نہیں۔ کیلا کھاتے ہی جذب طاری ہوگیا اور ہوش وحواس ختم ہوگئے۔

گھر والوں کو خبر ہوئی تو پکڑ کر لے گئے۔ گرم لوہے سے جسم کو داغا لیکن میری حالت وہی رہی اور میں بدستور جذب ومستی میں ڈوبا رہا۔ آخر کار مجبور ہوکر فیصلہ کیا کہ مجھ کو وہیں لے جایا جائے جہاں سے یہ بیماری لگی ہے۔ میری برادری کو یہ قطعی منظور نہیں تھا کہ ایک برہمن کسی مسلمان کے پاس جائے لیکن مجبوری نے بالآخر انہیں آمادہ کر ہی لیا۔

باباصاحبؒ کے دربار میں پہنچتے ہی حکم ہوا: "زنجیریں کھول دی جائیں۔ یہ اچھا ہے۔"

میں اسی وقت ہوش میں آگیا۔

باباصاحبؒ نے فرمایا: "اب تم تحصیل دار نہیں رہے۔"

لوگوں نے کہا: "حضور! دیوانگی کی وجہ سے یہ نوکری پر نہ جاسکے۔ اس لئے ان کی نوکری ختم ہوگئی ہے۔"

باباصاحبؒ نے ایک سادے کاغذ پر اپنے دستِ مبارک سے اپنا نام لکھ کر مجھے دیا اور فرمایا: "لو پرسرام! تحصیل دار تمہارے جوتے اٹھائیں گے۔ اللہ اللہ کرتے رہو۔"

حضور باباصاحبؒ کا فرمان پورا ہوا۔ تحصیل دار درگا پرشاد اور مہاراجہ قرولی جیسے لوگ میرے جوتے اٹھانا فخر سمجھتے ہیں۔

محبوب کا دیدار

اجمیر شریف میں ایک صاحب جذب ومستی کے عالم میں دکھائی دیتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف کوئی خاص توجہ

نہیں تھی۔ لوگ انہیں چائے پلاتے مگر بہت تھوڑی سی مقدار حلق میں جاتی تھی۔ باقی گرجاتی تھی۔ ان صاحب کو حضرت بابا تاج الدینؒ کی ذات بابرکات سے فیض ہوا تھا۔ انہوں نے لندن جاکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور وہاں سے بمبئی آکر پریکٹس کا ارادہ کیا۔ آفس کے لئے فرنیچر اور دیگر ضروری سامان کی خریداری کے لئے بازار گئے اور خریداری کرنے کے بعد باربرداری کا انتظام کرنے لگے۔ اس دوران سامنے عمارت کی کھڑکی کھلی اور ایک رُخِ زیبا پر نظر پڑی۔ نہ جانے کیا دیکھا مبہوت ہوکر رہ گئے۔ کھڑکی بند ہوجانے کے بعد بھی ان کی نگاہیں اسی طرف مرکوز رہیں۔

صبح سے دوپہر کا وقت ہوا اور پھر شام قریب آنے لگی لیکن وہ بے خودی اور وارفتگی کے عالم میں دیدارِ محبوب کی تمنا کے ساتھ وہیں کھڑے رہے۔ شام کے وقت اس عمارت سے ایک جنازہ باہر نکلا۔ ان کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ ان کی دنیا لٹ چکی ہے اب وہ اپنے محبوب کے حسین سراپا کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

جنازے کے ساتھ ساتھ وہ بھی چلتے رہے اور قبرستان پہنچ گئے۔ جب سب لوگ لاش کو سپردِ خاک کرکے واپس چلے گئے تو وہ بے تاب ہوکر قبر سے لپٹ گئے اور زاروقطار رونے لگے۔ آنسوؤں کی جھڑی کسی طرح رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ روتے روتے سورج غروب ہوگیا اور اندھیرا چھاگیا۔ اسی حالت میں دیکھا کہ ایک بزرگ کھڑے فرمارہے ہیں: "ناگ پور آکر ہم سے ملو، ہم تاج الدین ہیں۔"

بزرگ کا لہجہ اس قدر پرتاثیر تھا کہ محبوب کے مزار کا طواف کرنے کا ارادہ ناگ پور جانے کی شدید خواہش میں بدل گیا۔

ناگ پور پہنچے تو باباصاحب روشکر در محل کے چبوترے پر رونق افروز تھے۔

انہوں نے باباصاحبؒ کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ باباصاحبؒ کی جگہ ان کا محبوب بصد ناز و ادا مسند نشیں ہے۔ وہ اس جلوے کی تاب نہ لاکر عالمِ سرمستی میں دوڑے اور محبوب کے قدموں میں جا پڑے۔ لمحے بھر میں باباصاحبؒ کی نگاہِ فیض سے کتنے ہی اسرار و رموز ان پر منکشف ہوگئے۔ ہوش آیا تو باباصاحبؒ نے فرمایا۔

"جاؤ، اجمیر شریف کی خدمت تمہارے سپرد ہے۔ ہر جگہ ہمیں دیکھتے رہو۔ اچھے ہو گئے:"

پانچ جوتے

ایک روز حضرت باباتاج الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک ضعیف العمر عالم حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: "حضرت، ان کو پانچ جوتے لگاتے ہیں!"

وہاں موجود تمام لوگ حیران ہوگئے لیکن عالم صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا کے لئے باباصاحبؒ کے حکم کی تعمیل کرو۔" ایک خادم نے آہستہ آہستہ پانچ جوتے ان کی پُشت پر مار دیئے۔ عالم صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو کیا ہوگیا تھا۔ انہوں نے کہا جو راستہ ساری عمر طے نہ ہوسکا وہ آنِ واحد میں طے ہوگیا۔

بیگم صاحبہ بھوپال

ایک دفعہ بیگم صاحبہ بھوپال نے نہایت اہتمام کے ساتھ اعلیٰ درجے کا کھانا تیار کرایا۔ کھانا تیار کراتے وقت ان کے مُنہ سے نکلا کہ ایسا کھانا باباصاحبؒ کو کون کھلاتا ہوگا۔ جب وہ کھانا تھالوں میں سجاکر خواصوں کے سر پر رکھ کر حاضرِ خدمت ہوئیں تو باباصاحب نے فرمایا: "یہ کھانا ہمارے کام کا نہیں ہے۔ ہمیں ایسا کھانا کون کھلا سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ بہت نادم ہوئیں۔

فاتحہ پڑھو

یوسف حسین خاں، ناظم ریاست جے پور دربار تاج الاولیاء میں اپنے والد کی صحت یابی کی دُعا کے لئے حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے انہیں دیکھتے ہی ان کے شانوں پر پڑی ہوئی شال اتار لی اور زمین پر بچھاتے ہوئے فرمایا: "فاتحہ پڑھو حضرت، فاتحہ:" اس کے ساتھ ہی باباصاحبؒ نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ یوسف حسین خاں صاحب نے بھی ہاتھ اٹھا دیے اور حاضرین نے بھی۔ فاتحہ کے بعد ناظم صاحب حکیم ظفر جے پوری کے گھر پہنچے تو وہاں تار کے ذریعے خبر آچکی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔ جے پور پہنچ کر معلوم ہوا کہ جس وقت باباصاحبؒ نے ناگ پور میں ان کے والد کی فاتحہ پڑھی تھی اسی وقت جے پور میں اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔

ABDUS SAMAD SUSPENDED

بھکی پور جالس کے عبدُالصمد صاحب دل میں یہ خواہش لئے ہوئے باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ انہیں کشف عطا ہو جائے۔ باباصاحبؒ کے روبرو پہنچے تو آپ بیڑی پی رہے تھے۔ باباصاحبؒ نے سلگتی ہوئی بیڑی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ لو کشف!"

عبدالصمد صاحب نے فوراً بیڑی لے کر گہرا کش لگایا۔ قوتِ کشف انگڑائی لے کر اٹھی اور لمحہ بھر میں عبدالصمد صاحب نے اپنے اندر مخفی صلاحیتوں کا بے پناہ ذخیرہ محسوس کیا۔ باباصاحبؒ نے بہت سے شہروں کے نام تیزی سے لئے اور فرمایا "جاؤ، ان مقامات پر ہر مرض میں تمہارے پانی سے شفا ہوتی ہے۔"

عبد الصمد صاحب اپنی مطلوبہ دولت لئے ہوئے واپس ہوئے۔ لوگ اتنی کثرت سے ان کے پاس آنے لگے کہ حکومت کو ریلوے اسٹیشن اور پولیس اسٹیشن کی تعمیر کرانی پڑی وہ جس پانی میں ہاتھ ڈالتے، وہ جان بلب مریض کو بھی بیماری کے منہ سے کھینچ لاتا۔ عبد الصمد صاحب کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک جا پہنچی۔

ایک دن ایک عورت ان کے پاس حاضر ہوئی۔ یہ زمانہ اس کے مخصوص ایام کا تھا۔ عبد الصمد صاحب نے ازراہِ کشف کہا: "ناپاک ہے، نکال دو!"

عورت پریشان حال شکستہ دل، تاگ پور پہنچی۔ اور شکر درہ سے باہر مولسری کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ پچھلے تجربے کی بنا پر وہ حاضر دربار ہونے سے ڈر رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف اس کے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

ادھر بابا صاحبؒ نے فرمایا: "جاؤ مولسری کے نیچے وہ بیٹھی ہے، بلا لاؤ!"

ایک عقیدتمند گیا اور اس کو بلا لایا۔ عورت کچھ فاصلے پر ہی کھڑی ہو گئی اور قریب آنے سے ہچکچانے لگی۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: "قریب آؤ اماں! عبد الصمد ایک لٹیا پانی تھا، گندا ہو گیا۔ تاج الدین سمندر ہے۔ یہاں آؤ اماں!"

عورت فوراً قدم بوس ہو گئی۔

بابا صاحبؒ نے فرمایا: "گھر جاتے ہیں، بچہ کھیلتا ملتا ہے، اچھا رہتا ہے۔"

ادھر عورت بامراد واپس ہوئی، اُدھر بابا صاحبؒ نے جانشی کی طرف منہ کر کے فرمایا۔ "ABDUS SAMAD SUSPENDED" (عبدُ الصمد کو معطل کیا گیا)

ان الفاظ کے ساتھ ہی عبد الصمد صاحب کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔

بدیسی مال

علی حسین صاحب ناگ پور کے تحصیل دار تھے۔ وہ ایک انگریز عورت کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور اسے شادی پر رضامند کر لیا عورت کی شرائط یہ تھیں کہ بنگلہ اس کے نام رجسٹری کرا دیا جائے اور تمام روپیہ بینک میں اس کے نام منتقل کرا دیا جائے۔ علی حسین صاحب کو یہ تمام شرائط دل وجان سے قبول تھیں۔ لیکن وہ سوچتے تھے انگریزوں کی حکومت ہے۔ کہیں انگریز عورت سے شادی کرنا کسی خطرے کا باعث نہ بن جائے۔ چنانچہ علی حسین صاحب نے ارادہ کیا کہ بابا صاحبؒ سے دعا کرانی چاہیئے۔ خطرہ دور ہو جائے گا۔

بابا صاحبؒ کی خدمت میں وہ شکر درہ پہنچے۔ اور زائرین کے ہجوم میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ دفعتہً بابا صاحبؒ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: "گھڑی دکھاؤ!"

علی حسین صاحب نے ہاتھ سے گھڑی اتار کر پیش کی۔ بابا صاحبؒ نے گھڑی کو دیکھا اور واپس دیتے ہوئے فرمایا: "حضرت، بدیسی مال اچھا نہیں ہوتا!"

علی حسین صاحب مطلب سمجھ گئے کہ یہ شادی ان کے لئے مناسب نہیں۔ لیکن انگریز عورت کی محبت بُری طرح ذہن پر حاوی تھی۔ انہوں نے خود کو فریب دیتے ہوئے سوچا کہ آج کل پورے ہندوستان میں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ ہے۔ بابا صاحبؒ نے اُسی کے متعلق مجھ سے کہا ہے۔ شادی کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

علی حسین صاحبؒ نے انگریز عورت سے شادی کر لی۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اور نوبت تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ ایک دن علی حسین صاحب نے غصے میں آ کر اپنی بیوی کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ بیوی نے مقدمہ دائر کر دیا۔ حکمراں قوم کے ایک فرد کو طمانچہ مارنا پوری انگریز قوم کی توہین تھی۔

علی حسین صاحب پہلے ہی اپنا تمام اثاثہ بیوی پر نثار کر چکے تھے۔ ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اب ہر وقت قید و بند کا خدشہ دماغ پر مسلط رہنے لگا۔ ناچار دوبارہ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدم بوسی کرنی چاہی۔ باباصاحبؒ نے فرمایا "نکو قدم بوسی (قدم بوسی نہیں)۔ پہلے یہ بتاؤ ہم نے جیل خانہ کس لئے بنایا ہے؟"

علی حسین سمجھ گئے تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ انہیں اپنے طرزِ عمل پر بہت افسوس ہوا کہ باباصاحبؒ کے صریح حکم کو انہوں نے غلط معنی پہنا کر خلاف ورزی کی۔ چنانچہ وہی ہوا جس کی طرف باباصاحبؒ نے اشارہ فرمایا تھا۔ علی حسین صاحب کو قید کی سزا سنادی گئی۔

آدھا دیوان

ایک مرتبہ یوسف حسین خاں صاحب حضرت باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا "جاؤ، تم کو آدھا دیوان کیا"۔

اس زمانے میں دیوان کا عہدہ ریاست میں صرف ایک تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آدھے دیوان سے کیا مراد ہے۔ کچھ عرصے بعد ریاست کو دو ضلعوں میں تقسیم کر کے دیوان اضلاع شرقی اور دیوان اضلاع غربی دو عہدے قائم کئے گئے اور ایک دیوان کی جگہ دو دیوان مقرر کئے گئے جن میں سے ایک یوسف حسین خاں بھی تھے۔

کیوں دوڑتے ہو حضرت

حسام الدین صاحب بیان کرتے تھے کہ باباصاحبؒ کی شہرت سن کر میں نے ارادہ کیا کہ میں آپ کا مرید ہو جاؤں۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ باباصاحبؒ ایک حوض پر وضو کر رہے ہیں۔ اس پانی کی عجیب تاثیر ہے کہ اس سے اعضا آئینہ کی طرح شفاف ہو جاتے ہیں۔ وضو کرنے کے بعد باباصاحبؒ نے مجھ سے کہا تم بھی وضو کر لو۔ میں نے بھی وضو کیا اور میرے اعضاء بھی آئینہ کی طرح چمکنے لگے۔ اس کے بعد باباصاحبؒ نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف

بڑھایا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آپکا دستِ مبارک تھام لیا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ میرے مرید ہونے کے خیال کی منظوری باباصاحبؒ کے ہاں سے ہو گئی ہے اس لئے اب حاضر ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ دفتر سے چھٹی لی اور مرید ہونے کے خیال سے ناگ پور پہنچا۔ شکر درہ میں باباصاحب کی سواری نمودار ہوئی۔ آپ تانگہ میں سوار تھے اور لوگوں کا ایک ہجوم پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نوجوانی کی وجہ سے دوڑ میں سب سے آگے نکل کر جوں ہی تانگے کے قریب گیا، باباصاحبؒ نے فرمایا: "کیوں دوڑتے ہو حضرت، خواب میں ہاتھ ملایا ہے وہ بس ہے"!

دال بھات

متھرا پرشاد امراؤتی والے کہتے تھے باباصاحبؒ کی غلامی پر پہلے بھی بہت سے ہندو بھائی مجھے طعنہ دیتے تھے۔ میرے گھر والے کہتے تھے کہ تیرا دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ یہ لعنت ملامت اس وقت اور بھی زیادہ ہو گئی جب میرا داماد مرض الموت میں گرفتار ہوا۔ میری بیوی نے مجھ سے کہا تم نے اپنا دھرم تو خراب کر ہی لیا، اب دنیا بھی خراب ہونے والی ہے۔ ایک بیٹی ہے، وہ بھی صبح و شام میں بیوہ ہونے والی ہے۔ آخر تمہارے بابا کس دن کام آئیں گے؟ تم ان کی بڑی کرامتیں بیان کرتے رہتے ہو۔ اپنے داماد کو تو موت سے بچاؤ"۔ بیوی کی بات تیر کی طرح میرے دل میں لگی۔ میں نے کہا اس کو ٹیکسی میں رکھ کر ناگپور لے چلو۔ ڈاکٹروں نے کہا یہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے، اگر مارنے کی جلدی ہے تو ضرور لے جاؤ۔ دوسرے لوگوں نے بھی بہت سمجھایا لیکن میں نہیں مانا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ اسے باباصاحب سے ٹھیک کرا کے دم لوں گا۔ ورنہ پھر تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا"۔ مختصر یہ کہ میرے گھر والوں نے میرے داماد کو بستر پہ ڈال کر ٹیکسی میں بٹھا دیا اور ڈاکٹر

کو ساتھ لے کر شکر درہ پہنچے۔ میں بس سے اتر کر سیدھا بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور جاتے ہی عرض کیا: "بابا! میں اپنے داماد کو ساتھ لایا ہوں جو چند لمحوں کا مہمان ہے۔ یا تو یہ اچھا ہو جائے ورنہ آپ کا منہ یہاں بھی کالا، وہاں بھی کالا۔"

میری یہ گستاخانہ بات سن کر بابا صاحبؒ نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرا ہاتھ مجھے مارنے کے لئے اٹھایا اور فرمایا: "کیا کہا؟"

میں نے کہا "بابا چاہے مارو، چاہے چھوڑ دو۔ بات یہی ہے جو میں نے کہی ہے۔ میری عزت و آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے۔" بابا صاحبؒ نے ہاتھ جھٹک کر فرمایا: "جا، دال بھات کھلا، اچھا ہو جاتا ہے۔"

میں واپس بھاگا اور دال بھات تیار کر کے اس کو کھلایا۔ تمام لوگ میری اس حرکت کو دیوانہ پن سمجھ رہے تھے کیونکہ پیچش کے مریض کو آخری اسٹیج پر جب کہ پانی بھی ہضم نہیں ہوتا، دال بھات کھلانا کوئی عقل مندی کی بات نہیں تھی۔ داماد دال بھات کھاتے ہی سو گیا۔ شام کو جاگا اور دوبارہ دال بھات مانگا۔ اور کھا کر پھر رات بھر سوتا رہا۔ اگلے دن وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ اور اپنے پیروں سے چل کر بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اٹیک، فائر

فرید صاحب قصّاب نے بیان کیا کہ تقریباً ۱۹۰۹ء کے ابتدائی زمانے میں بابا صاحب واکی شریف میں مقیم تھے۔ میں پروفیسر محمد عبد القوی لکھنوی کے ساتھ بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے پہنچا۔ پتہ چلا کہ بابا صاحبؒ واکی شریف سے سات آٹھ میل دور جنگل میں تشریف فرما ہیں۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بابا صاحب ایک کھیت میں تشریف رکھتے ہیں۔ چاروں طرف ببول

کے درخت ہیں جس کے سائے میں حاضرین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت بابا صاحبؒ کھیت میں پتھر چن چن کر ڈھیر بنا رہے تھے۔ ہم دونوں بھی سلام کر کے اسی کام میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ دو ڈھائی فٹ اونچا ڈھیر تیار ہو گیا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: "اب دوسرا ڈھیر بناؤ اور جلدی بناؤ۔"

ہم لوگوں نے جلدی سے دوسرا ڈھیر تیار کر دیا۔ اب بابا صاحبؒ نے ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر فوجی احکامات جاری کرنا شروع کر دیے: "فلاں ڈویژن ادھر مارچ کرو، فلاں ڈویژن ادھر جاؤ، اٹیک، فائر!"

بابا صاحب ایک خاص کیفیت میں یہ احکامات جاری کرتے رہے اور پھر فرمایا "یونانی بھاگے، پکڑو، پکڑو!"

پھر فرمایا: "ہم نے یونانیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ اب کبھی مقابلے پر کھڑے نہ ہوں گے۔" بابا صاحبؒ نے ہاتھ کی لکڑی پتھروں کے ڈھیر میں نصب کرتے ہوئے کہا: "یہ ترکی کی فتح کا جھنڈا ہے۔"

دو تین روز بعد اخبارات میں یہ خبر آئی کہ جنگ بلقان میں ترکوں نے یونانیوں کو بری طرح شکست دے دی اور ان کے ہاتھ کثیر مالِ غنیمت آیا ہے۔

جنگِ عظیم اول کے واقعات و حالات بابا صاحبؒ اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ خود جنگ میں شریک ہوں۔ لوگ ان واقعات کو نوٹ کر لیتے اور چند روز بعد اس کی تصدیق ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بابا صاحبؒ نے غصے میں پتھر اٹھا کر ایک مکان کو مارا اور کہا: "بڑا آیا ایمڈورب، فتح نہیں ہوتا۔"

لوگوں نے وقت نوٹ کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی وقت ایمڈورب

پر ایک بم گرا اور وہ فتح ہو گیا۔

علی برادران اور گاندھی جی

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ناگ پور آئے۔ تو بابا صاحبؒ کے پاس حاضر ہونے کے بجائے راجہ رگھوجی راؤ کو لکھا کہ بابا صاحبؒ سے ملنے کا وقت مقرر کر دیں۔ راجہ صاحب پریشان ہو گئے کہ کون سا وقت دیں۔ بابا صاحبؒ کے کوئی اوقات مخصوص نہیں تھے۔ لوگ ہر وقت حاضر ہوتے اور نہ ہی بابا صاحبؒ کسی کو وقت دیتے تھے۔ بابا صاحبؒ نے خود ہی راجہ صاحب سے کہا: "ان سے کہو جمعہ کے دن چار بجے ہمارے ساتھ چائے پئیں۔" راجہ صاحب نے علی برادران کو مطلع کر دیا۔ جمعہ کے دن ٹھیک چار بجے حضور بابا صاحبؒ کمرے سے باہر تشریف لائے، چائے طلب کی اور حکم دیا کہ حاضرین کو چائے پلائی جائے۔ علی برادران وقت پر نہ پہنچ سکے۔ سب نے چائے پی اور پانچ بجے بابا صاحبؒ نے سواری طلب کی اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں علی برادران کی موٹر آتی ہوئی نظر آئی۔ کوچوان نے گاڑی روک دی۔ علی برادران نے کار سے اتر کر سلام عرض کیا۔

بابا صاحبؒ نے کوچوان سے کہا: "کیوں رے، ان کو ہار دے دوں؟"

اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: "ہاں بابا، دے دو۔"

بابا صاحبؒ نے فرمایا: "میں کیا دوں گا، تو ہی دے دے۔" ہیرا کوچوان نے کچھ ہار اٹھا کر علی برادران کو دے دیے۔

بابا صاحبؒ نے فرمایا: "جاؤ پھاٹک دیکھو۔"

اس کے ساتھ ہی بابا صاحبؒ کی سواری شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ علی برادران بابا

صاحبؒ کے ارشاد کا مطلب کچھ بھی نہیں سمجھے۔

اسی وقت ناگ پور میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا اور علی برادران خلافت کے سلسلے میں جلسہ کرنے والے تھے۔ گاندھی جی بھی آئے ہوئے تھے۔ بابا صاحبؒ کی آمد کا شور سنا تو سب سڑک پر آ گئے۔ اور سلام عرض کیا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: "جاؤ، آٹھ سو کوے اڑا دیے۔"

گاندھی جی اس ارشاد کو کوئی معنی نہ پہنا سکے۔ رات کو جلسہ ہوا تو آٹھ سو ممبران کٹ کر گاندھی جی کی طرف آ گئے۔ اس وقت گاندھی جی کو بابا صاحبؒ کے ارشاد کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ ایک زمانہ میں گاندھی جی روزانہ بابا صاحبؒ کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ بابا صاحبؒ ان کو ڈانٹتے لیکن وہ پروا نہیں کرتے۔ اور پابندی سے حاضر ہوتے تھے۔

علی برادران خلافت کے جلسوں میں تقریر کے بعد بمبئی پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا جب وہ جیل کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگے تو بابا صاحبؒ کا ارشاد یاد آیا کہ "جاؤ پھاٹک دیکھو۔"

بے تیغ سپاہی

نواب صدیق علی خاں صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک بہت فعال اور سرگرم رکن رہے ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں اور اس کے واقعات پر ایک قابلِ قدر کتاب "بے تیغ سپاہی" قلم بند کی جس میں انہوں نے حضرت تاج الاولیاء بابا تاج الدینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

جب میں والد مرحوم کی انگلی پکڑ کر بابا کے دربار میں گاہے گاہے جایا کرتا تھا بابا صاحبؒ بالعموم لمبا کرتا پہنتے اور برہنہ سر اور برہنہ پا رہتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت پیادہ

چلنے میں گزارا کرتے تھے۔ ایک دن اپنے سلیم شاہی جوتے پہنے ہوئے جس کی ایڑی کے
جسے کو میں نے شرارت میں سپاٹ بنا دیا تھا۔ بابا صاحبؒ کے پیچھے پیچھے والد کے ساتھ
جا رہا تھا کہ بابا صاحبؒ ایک دم رک گئے اور مجھ سے فرمایا "لاؤ جی ہم تمہاری جوتی پہنیں
گے۔" میں گھبرا گیا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کرنے کو کہا۔
بابا صاحبؒ نے اپنے پیروں کی چند انگلیاں ڈال کر میری جوتیاں پہن لیں اور تھوڑی دیر
تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ یقیناً یہ میری بڑی سرفرازی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد
اس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے اور جولائی سنہ ۱۹۶۱ء میں افریقہ کی سفارتی
صحرا نوردی کے بعد ختم ہوئے۔

ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ اپنا کچھ وقت تانگہ میں بیٹھ کر ناگ پور کے گلی کوچوں
میں پھر کر گزارا کرتے تھے۔ وہ اکثر ہمارے آبائی گھر کے سامنے سے جو میرے بزرگوں کے
بسائے ہوئے نواب محلہ میں واقع تھا سواری میں گزرا کرتے اور اسے رشکِ ارم
بناتے۔ جذبۂ عشقِ خداوندی سے وہ اکثر اوقات بے تاب ہو کر بلند و پست آواز
میں سلسلۂ تکلم جاری رکھتے جو بعض اوقات مجھ ایسے کوڑھ مغزوں کے لئے بے معنی لیکن
عارفینِ حق کے لئے معرفت کا ایک بحرِ ذخار ہوتا۔ ان کا جلال کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ ستانے
والوں کو زد و کوب سے بھی باز نہ آتے۔ اور خصوصاً ان کی بہت پٹائی کرتے جو اُن کے
سامنے منہ کے بل اوندھے پڑ جاتے یا پیر پکڑ کر منتیں مرادیں مانگتے۔ میں اس دن کا
واقعہ سنانا چاہتا ہوں جب دن میری بڑی بہن جو صرف خاندان ہی میں نہیں بلکہ اس
سے باہر بھی بہت محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ہم سب کو روتا چھوڑ کر
اس دنیا سے منہ موڑنے والی تھیں۔ دوپہر سے قبل ہم سب نے بابا کی سواری کو اپنے

غم کدہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا اور سب اہلِ خاندان میری بہن کی گرتی ہوئی
حالت دیکھ کر طالبِ دعا ہوئے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی حالت تیزی
سے بگڑنے لگی اور سب کو یقین ہو گیا کہ بس اب دمِ واپسیں ہے۔ عزیزوں نے خاموش
آہ و زاری شروع کر دی۔ عصر و مغرب کے درمیان اطلاع ملی کہ حضور کی سواری پھر آ رہی
ہے۔ میں چشمِ پُرنم کے ساتھ بے تحاشہ بھاگتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ حضور نے سواری رکوائی۔
کچھ بے ربط جملے فرمائے جو میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ غالباً رحلت کی اطلاع اور دلاسا
دینا مقصود تھا۔

تیسرے واقعے کا تعلق میرے ہم عمر عزیز دوست سید عظیم الدین عرف میر
صاحب سے ہے جو میرے بھائیوں جیسے تھے۔ میرے والد نے میر صاحب کی والدہ کو
بہن بنایا تھا۔ اس مناسبت سے میں انہیں پھوپھی اور سید احمد حسین صاحب پٹیل کو پھوپھا کہتا تھا
انہوں نے بابا صاحبؒ سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر ان کے دربارِ عرفان میں دنیا چھوڑ کر
مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر صاحب کو شکار کا اتنا شوق تھا کہ وہ ناگ پور کے اکناف
یا اپنے مال گزاری گاؤں کے اطراف تمام وقت ہرن کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ المختصر وہ
دماغی توازن کھو بیٹھے اور مارنے پیٹنے پر اتر آئے۔ لوگ اور محلے والے ان سے ہراساں
اور خوف زدہ رہنے لگے۔ ان کے والد نے دلی وابستگی کی وجہ سے میر صاحب کے ہاتھ
پاؤں لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر ان کو تاج الاولیاءؒ کے دربار میں پہنچا دیا۔ میر صاحب
تنومند، گورے چٹے، خوبصورت، دراز قد نوجوان تھے۔ دست درازی اور دشنام
طرازی اس زمانے میں ان کا مشغلِ حیات بن گیا تھا۔ میں ان کی حالتِ زار دیکھنے اور
چار آنسو بہانے روزانہ جاتا تھا۔ ایک دن میرے والد محترم نے جنہیں علمِ طب سے

شغف تھا فرمایا اگر میر صاحب کی فصد کھلوائی جائے تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔ جب میں
نے یہ پیغام ٹیپل صاحب کو ان کی فرودگاہ پر پہنچایا تو وہ بالکل چراغ پا ہو گئے اور فرمایا
کہ بابا صاحب کے دربار میں ان کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کیا جائے گا۔ میں آزردہ خاطر
اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹا اور والد کو کل احوال سنایا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن میں نے
دوسرے دن تک اپنا تمام وقت یہ سوچنے میں کاٹا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ حسب معمول
عازمِ شکر درہ ہوا۔ دل نے کہا بابا صاحب کشف ہیں۔ ان سے دل ہی دل میں کہہ ڈالو
کہ میر صاحب کے والد کے دل میں خدا فصد کھلوانے کا خیال ڈال دے تاکہ میرا محبوب
ترین دوست پھر سے تندرست ہو جائے۔ میں دربار میں پہنچا۔ وہاں روز جیسی چہل پہل
تھی۔ عقیدت مند اور حاجت مند بابا صاحب کو دو تہائی گھیرے میں لئے بیٹھے تھے۔
بابا صاحب ہمیشہ کے مطابق جذب سے سرشار اونچی اونچی آواز میں بولتے چلے جا رہے
تھے۔ دائرہ کا جو ایک تہائی حصہ کھلا پڑا تھا اس سمت میں بہت دور میر صاحب زنجیروں
کے بندھن میں چیختے چلاتے ہاتھ پیر مارتے ہوئے پڑے تھے۔ ایسی حالت میں بھی وہ
مجھ سے قولاً یا فعلاً بری طرح پیش نہیں آئے۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور بابا
صاحبؒ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس جھرمٹ میں ٹیپل
صاحب پھوپھا ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان کی غیر متوقع موجودگی نے میری دلی تمنا
کو تازیانہ لگایا۔ اور میرا دل تڑپ گیا۔ اپنی دلی خواہش کو زبان ہلائے بغیر بابا صاحبؒ
تک پہنچا دیا۔ اور میں انتہائی توجہ کے ساتھ اپنے جواب کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔
باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور میں بے چینی سے جواب کا منتظر تھا کہ بہ آوازِ بلند ایک جملہ
فرمایا گیا تاکہ پھوپھا صاحب، میں اور دیگر سامعین اچھی طرح سُن لیں۔ ٹھیٹ مدراسی

لب و لہجہ میں ارشاد فرمایا: "پیشانی کی رگ کاٹ کر خون نکال دیو جی، اچھے ہو جاتے"۔
میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا اور پھوپھا صاحب کی طرف جھپٹا۔ انہوں نے مجھے موقع
دیے بغیر کہا: "جاؤ بابا، تمہارا جو جی چاہے کرو"۔ میں میر صاحب کو تانگہ میں ڈال کر گھر
لے گیا۔ والد صاحب بہت خوش ہوئے اور سو نسلہ راجاؤں کے خاندانی جرّاح سید احمد
صاحب کو جو نانے پار رہا کرتے تھے، شام کو بلوا کر میر صاحب کی فصد کھلوائی اور پھر
میر صاحب اللہ کی مہربانی سے دوبارہ بھلے چنگے ہو گئے۔

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ سُنا کر اپنی عقیدتمندانہ شیفتگی کو تازہ اور زیادہ
مستحکم کر دوں۔ اس زمانے میں سی پی و برار کے ہائی اسکولوں کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی
سے ہونے کی وجہ سے میٹرک کے امتحان کے پرچے الٰہ آباد یونیورسٹی سے آیا کرتے تھے۔
حساب کے تین علیحدہ پرچے ہوا کرتے تھے۔ میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوا لیکن
حساب میں بہت کمزور ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ والد صاحب کے دل کو بہت ٹھیس
لگی کیوں کہ انہوں نے میرے لئے بہت سے منصوبے تیار کیے تھے۔ میں بہت مایوس و
شرمسار تھا۔ بالآخر کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت مل گئی۔ وہاں سب سے
بڑی آسانی یہ تھی کہ حساب کا صرف ایک پرچہ ہوا کرتا تھا۔ امتحان میں شریک ہوا اور کلکتہ سے
روانہ ہوتے وقت چار دوستوں کو تاکید کر کے ناگ پور لوٹا کہ نتیجہ جیسے ہی شائع ہو مجھے فوراً
مطلع کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ امتحان کے نتیجے کا انتظار ایک طالب علم کے لئے کس
قدر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ میری بھی یہی اضطرابی کیفیت تھی۔ اور کبھی کبھی تو
میرا اضطراب اس خیال سے ہوش اڑا دیتا تھا کہ اگر اب کے ناکام ہو گیا تو والد صاحب کو
ناقابلِ بیان صدمہ ہو گا اور میں انہیں اپنا منحوس چہرہ کیسے دکھاؤں گا۔ کلکتہ سے نتیجے

وصول یابی میں کافی تاخیر ہو جانے کی وجہ سے دل بہت پریشان تھا۔ میں اس دن
شکر وہ میر صاحب کی عیادت کو گیا مگر تڑپتے دل سے دل ہی دل میں بابا صاحبؒ سے
عرض مدعا کر بیٹھا یعنی آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس دربار
سے تو کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ ہنستا میں کیسے بے مرام لوٹتا۔ فدائیوں نے حضور کو
گھیر رکھا تھا۔ میں بہت دور سوالی بنا ہوا میر صاحب کے پاس بیٹھا کسی کرامت کا انتظار
کر رہا تھا۔ معلوم نہیں زور زور سے کیا کیا بہت سے بے ربط جملے ارشاد کئے جا رہے
تھے کہ کیا دیکھتا ہوں عیسیٰ خاں صاحب جو ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہا کرتے اور بابا صاحبؒ
کی ڈاک رکھا کرتے تھے بابا صاحبؒ کے جو کھردری زمین پر لیٹے ہوئے تھے، پیر دبا رہے
تھے، بابا صاحبؒ اچانک اٹھ بیٹھے۔ عیسیٰ صاحب کے کرتے کی بالائی جیب میں ہاتھ
ڈال کر چار پوسٹ کارڈ ہوا میں پھینکتے ہوئے بآواز بلند فرمایا: "جاؤ جی! نتیجہ آگیا، پہلے
درجے میں پاس کر گئے۔" میں خوشی خوشی بائیسکل لے کر گھر کے لئے روانہ ہوا۔ مکان کے باہر
شہ نشیں کے قریب پہنچ کر سائیکل سے اترا ہی تھا کہ دور سے کسی نے زور سے پکار کر کہا۔
"میاں! میاں! ذرا رک جائیے اور اپنی ڈاک لیتے جائیے۔" دھڑکتے ہوئے دل سے
مڑ کر دیکھا۔ ڈاکیہ نے چار پوسٹ کارڈ دیئے۔ مضمون من وعن وہی تھا جس کا انکشاف
پہلے ہی تاج الاولیاء کر چکے تھے۔

نواب صدیق علی خان مزید لکھتے ہیں: "ایک دن میرے والد صاحب حضرت
بابا صاحبؒ کے لئے نہایت اہتمام سے اندرسے کی مٹھائی جسے پوسی کہا جاتا تھا، بنوا کر
لے گئے۔ بابا صاحبؒ پاگل خانے کے باہر سڑک کے کنارے گٹی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے
تھے۔ چند حاجت مند لوگ منت اور مرادوں کے کشکول لئے ہوئے دربار میں موجود تھے۔

والد نے مٹھائی پیش کی جسے حضورؒ بہت شوق اور رغبت سے کھانے لگے۔ والد صاحب
کے دل میں معاً یہ خیال آیا کہ حضورؒ کو ایسی مٹھائی کہاں سے ملتی ہوگی۔ حضورؒ نے فوراً
ہاتھ روک لیا اور پتھر اٹھا کر اس طرح آسانی سے کھانے لگے جیسے بڑا لذیذ حلوہ
کھا رہے ہوں۔ جب والد نے ندامت کے آنسو بہائے اور دل سے توبہ کی تو حضورؒ
نے پتھروں کا کھانا بند کر دیا۔"

ہندو مسلم فساد

ڈاکٹر سید محمود صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹر
ہوئے۔ پٹنہ میں پریکٹس کرتے تھے۔ لیکن تحریک خلافت کے وقت میدانِ سیاست
میں آ گئے۔ کانگریس کے ممتاز لیڈر تھے اور متعدد بار صوبے اور مرکز میں وزیر مقرر ہوئے
مصر میں سفارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ڈاکٹر محمود صاحب بیان کرتے ہیں:

"سنہ ۱۹۲۴ء میں ناگ پور میں ہندو مسلم جھگڑے چل رہے تھے۔ بہت کشت و
خون ہو رہا تھا۔ طرفین سے لوگ جیل جا رہے تھے۔ مسجد کے سامنے باجے کا جھگڑا تھا۔
گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ تم وہاں جا کر اس کو طے کراؤ۔ مولانا شوکت علی مرحوم پہلے
جا چکے تھے لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے پہلے وہاں جانے سے انکار کیا پھر
گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں صاحب کے اصرار پر راضی ہوا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے کہا تھا
کہ تم کو بزرگوں سے ملنے کا شوق ہے۔ وہاں جا کر تم بابا تاج الدین سے ملنا اور ان سے
اس جھگڑے کے طے ہو جانے کے لئے دعا کرانا۔

میں ناگ پور گیا اور بابا تاج الدین کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ راجہ بھونسلہ کے قلعے
کے اندر رہتے تھے۔ راجہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور ان کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ تھوڑی

دیر بعد معلوم ہوا کہ بابا آج باہر نہیں نکلیں گے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں دروازے پر کھڑا تھا کہ سامنے دالان میں ایک دراز قد سیاہ فام بزرگ جن کی آنکھیں سُرخ تھیں یک بیک آکر کھڑے ہو گئے اور پھر اندر چلے گئے۔ نوکر نے آکر آواز دی کہ بابا اب نکلیں گے۔ چنانچہ وہ نکلے اور ایک فٹن میں سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ لوگوں کا اژدہام گاڑی کے پیچھے دوڑا اور ان پر پھول پھینکتا رہا۔ اور بابا کچھ بولتے رہے۔ اسی میں لوگ اپنے مطلب کی بات نکال لیا کرتے لیکن کسی سے بھی کوئی بات صاف نہیں ہوتی۔ مجھ سے بھی لوگوں نے گاڑی کے ساتھ دوڑنے کی فرمائش کی لیکن میں نہیں گیا۔ پھول البتہ ان پر پھینک دیا۔ لوگ اس طرح ان کے ساتھ میل ڈیڑھ میل دوڑا کرتے۔ یہ برابر کا دستور تھا۔ میں موٹر پر تھا۔ کچھ دیر بعد میری موٹر نے دوڑ کر ان کی گاڑی کو پکڑ لیا۔ اب لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ میں گاڑی پکڑ کر چلنے لگا۔ بابا میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: "کیا چاہتا ہے، مکہ مدینہ جائے گا؟"

میں نے عرض کیا: "انگریزوں کی غلامی اب برداشت نہیں ہوتی۔ ہندو مسلمانوں کو برابر لڑاتے رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے کب تک جائیں گے؟"

بابا نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا: "ہاں! ہاں! ضرور چلے جائیں گے۔"

راجہ کے دو ملازم گاڑی پر ان کے ساتھ ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ بابا سے ایسی صاف بات شاید انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ بہت گھبرائے اور کہا کہ آج تک بابا نے ایسی صاف طور پر بات نہیں کی تھی۔ تم تو کوئی دیوتا معلوم ہوتے ہو۔ پھر میں نے کہا آپ کی موجودگی میں ناگ پور میں ہندو مسلم جھگڑا ہو، یہ تعجب کی بات ہے۔ ہندو تو آپ کی اس قدر سیوا کرتے ہیں، پھر مسلمانوں سے کیوں لڑتے ہیں؟ آپ دعا کیجئے

کہ یہ قضیہ طے ہو جائے۔"

بابا نے کہا: "ہاں ضرور طے ہو جائے گا۔"

اس طرف سے کچھ سفید پوش مسلمان گزر رہے۔ میں نے ان کو مخاطب کر کے کر کے آواز دی کہ دیکھو بابا کیا کہتے ہیں۔ بابا کہتے ہیں کہ ہندو مسلم جو جھگڑا ہو رہا ہے، وہ طے ہو جانا چاہیئے۔

بابا نے کہا: "ہاں! ہاں! طے ہو جانا چاہیئے۔"

جب میں گاڑی سے اترنے لگا تو بابا نے پوچھا: "اور کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا: "آپ کی دعا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے سر سے اُتار کر ایک سُرخ لٹھے کا مراٹھی صافہ مجھے دیا۔ اور کہا: "رکھ لے، ہندو مسلم جھگڑا میں نے طے کرا دیا۔"

میں پھر بابا کے پاس گیا۔ راجہ کو معلوم ہوا۔ اس نے مجھے بلوایا اور میرے پیروں پر پھول چڑھائے اور مٹھائی رکھی کہ آپ تو کوئی دیوتا ہیں۔ مجھے اپنے ملازمین سے آپ اور بابا کی گفتگو کا حال معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ایسی صفائی سے گفتگو بابا کسی سے نہیں کرتے۔ پھر مجھے بابا کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ایک ملازم ان کے پیر دبا رہا تھا۔ میں نے کہا: "بابا! وہ ہندو مسلم جھگڑا آپ کی دعا سے طے ہو گیا۔"

کہا: "اچھا ہوا!"

پھر میں نے سوال کیا کہ بابا، انگریز اس ملک سے کب تک جائیں گے؟

بابا نے خفا ہو کر جواب دیا: "ارے میاں، جب تم لوگ اس قابل ہو گے تو خود چلے جائیں گے۔"

میں ذرا سہم گیا۔ بابا نے رٹ لگائی: "گھر جاؤ۔"

میں کچھ دیر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن باباؒ یہی کہہ رہے تھے کہ گھر جاؤ، گھر جاؤ۔ میں مجبور ہو کر اٹھ آیا۔ میرے ہمراہ دو صاحب تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "دیکھئے، میں آپ کو ہر چند یہاں آنے سے منع کرتا رہا مگر آپ نہ مانے۔ یہ ایک مجنون آدمی ہے۔ اس کو فقیر بنا رکھا ہے اور بداخلاق کس قدر ہے کہ آپ کو بیٹھنے بھی نہ دیا۔ اور اپنے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ اٹھا دیا۔"

دوسرے صاحب نے کہا: "نہیں، باباصاحبؒ کا مطلب ہے کہ مسلمان اپنے گھر یعنی مکہ مدینہ چلے جائیں۔ پھر یہاں زائر کی حیثیت سے آئیں۔"

مجھے ان کے اس استدلال پر ہنسی آگئی۔ بہرحال میں اسی دن شب میں الٰہ آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن آنند بھون (پنڈت جواہر لال نہرو کا گھر) پہنچا جہاں میں ٹھیرا کرتا تھا۔ وہاں میرے لئے ایک تار پہلے سے آیا ہوا تھا کہ جونپور میں میرے ماموں زاد بہنوئی کا اسی وقت انتقال ہوا جس وقت میں باباؒ سے ناگ پور میں باتیں کر رہا تھا۔

بھوت بنگلہ

ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ میں بابا تاج الدینؒ سے متعلق واقعات "تاج الدین بابا" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ ان واقعات کے راوی خان رشید صاحب ہیں۔ ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ کے شکریے کے ساتھ ان واقعات کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

پراسرار قہقہہ: نوجوان عثمان اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے ناگ پور تعینات کیا گیا۔ اس نے جس بنگلے میں قیام کیا وہ آسیب زدہ مشہور تھا۔ لوگوں نے اسے پہلے پیش آنے والے واقعات سنا کر بنگلے میں قیام کے ارادے سے باز رکھنا

چاہا۔ انگریز اسٹیشن ماسٹر، نورمین نے بھی منع کیا۔ لیکن اس نے ان باتوں پر توجہ نہ دی۔

رات کو بارہ بجے جب عثمان بستر پر لیٹا ہوا تھا، باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ اور چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بنگلے کے احاطے میں ایک زوردار قہقہہ گونجا۔ اور کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ صبح عثمان کمرے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ برآمدے میں ہلدی میں پکے ہوئے چاول اور مٹی کی ایک ہنڈیا ٹوٹی پڑی تھی۔ اگلی رات بھی اس سے ملتا جلتا شور سنائی دیا۔ اور صبح برآمدے میں ایک انسانی ہاتھ پڑا ہوا ملا۔

ان حالات کے باعث عثمان کے اعصاب جواب دے گئے اور اگلی رات اس نے ایک ہوٹل میں گزاری۔ حسبِ عادت صبح عثمان جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ ہجوم ایک سبز پوش بوڑھے کے پیچھے لگا ہوا تھا جو منہ ہی منہ میں کچھ بول رہا تھا۔ اس دوران بوڑھا تانگے میں سوار ہو کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ بزرگ تاج الدین باباؒ ہیں۔ عثمان پہلے بھی تاج الدین بابا کا تذکرہ ایک ولی اللہ کی حیثیت سے سن چکا تھا۔

مٹی کی تصویر: سیر کے دوران عثمان کالج کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک ہم وطن عبدالغفار نے آواز دی۔ وہ ان دنوں قانون کا طالب علم تھا۔ اس کے جیل پور کے دو اور ساتھی فضل الکریم اور عباسی بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہیں عثمان کی آمد کا علم ہوا تو خوشی میں چائے پر مدعو کر لیا۔

مقررہ وقت پر وہ ہاسٹل پہنچ گیا۔ "چلو چائے شہر میں پئیں گے۔" عباسی نے کہا "موقع ملا تو تاج الدین بابا سے بھی مل لیں گے۔"

سارے راستے اسی نوع کی گفتگو ہوتی رہی۔ اسی میں معراج کا مسئلہ چل نکلا فضل الکریم رُوحانی اور عبدالغفار جسمانی معراج کے قائل تھے۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں چائے پی کر وہ لوگ شکر درہ پہنچے تو وہاں عجیب منظر دیکھا۔ ایک فوٹوگرافر بڑا سا کیمرہ تپائی پر جمائے باباؒ کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ اس پر رضامند نہ تھے۔ تاہم اس کے اصرار پر کرسی پر بیٹھ گئے مگر وقت پر ہل جاتے تھے۔ فوٹوگرافر افسردگی سے بولا: "بابا! میں تو آپ کی تصویر فروخت کر کے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں تھا مگر آپ کو ذرا خیال نہیں۔"

"کیا بولا رے، کیا بولا!" بابا تڑپ گئے: "لے، اچھا اُتار لے میری تصویر۔"

تصویر کھینچ لی گئی، فوٹوگرافر خوش ہو گیا۔ معاً بابا کی نگاہ ان چاروں پر پڑی، تو تیوری پر بل پڑ گئے۔ اور بولے: "انگریزی پڑھ کے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضورؐ کو معراج رُوحانی ہوئی تھی۔"

چاروں چونک پڑے اور باباؒ اپنے حجرے کی طرف چل دیے۔ اب انہیں باباؒ کے سامنے جانے کی ہمت نہ تھی واپسی کا ارادہ کیا مگر عثمان اور عبدالغفار آگے بڑھے ایک خدمت گار باباؒ کے پاؤں دابنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بابا نے اسے منع کر دیا۔ اور عبدالغفار کی جانب دیکھ کر بولے: "لے رے لڑکے، تو پیر دبا۔"

عثمان نے بھی شامل ہونا چاہا لیکن باباؒ نے اُسے منع کر دیا۔ عبدالغفار نے پنڈلی کو ہاتھ لگایا تو وہ بے حد سخت تھی۔ بابا نے پٹھے اکڑائے تھے۔ دو منٹ بعد اس نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا: "بابا! آپ تو پنڈلی اکڑائے بیٹھے ہیں، میں پاؤں کیسے دباؤں؟"

"تو ڈھیلی کر نے نا، لگا سائنس کا زور!"

"اس میں سائنس کام نہیں آتی۔ آپ خود پاؤں ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔"

وہ پہلے ہنسے اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے: "تو اچھا لڑکا ہے، بتا کیا چاہتا ہے؟"

"بابا! پڑھ لکھ کے نوکری تو مل جائے گی مگر خدا کیسے ملے؟"

وہ تدرے چونک کر کہنے لگے: "محنت کرتے، بچے پالتے، خدا مل جاتا جی۔"

فضل الکریم اور عباسی داخل ہوئے تو وہ اُدھر متوجہ ہو گئے: "کیوں رے! اب بتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج روحانی ہوئی کہ جسمانی؟"

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عبدالغفار فوراً بولا: "بابا غلطی ہوئی، معاف کر دو۔"

وہ خوش خوش نظر آئے، پھر یوں گویا ہوئے: "کرسی پہ بیٹھو گے، فوٹو اترواؤ گے، پھر سمجھ میں آجائے گا۔ اچھا اب تم جاؤ۔"

پُراسرار گارڈ: عثمان عرضِ مدعا نہ کر سکا اور ساتھ کر چلنے ہی والا تھا کہ باباؒ کی آواز آئی: "او نالائق! تو کاٹے کو ڈرتا ہے؟ ڈنڈا رکھ کے سونا۔ وہ آئیں گے، مار دینا۔" عثمان ان کی طرف متوجہ ہوا تو ہنس کے بولے: "تیری سمجھ میں بھی آجائے گا، معراج جسمانی ہوئی کہ روحانی۔"

پھر دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہو گئے اور مخصوص انداز میں بولنے لگے۔ اسی لمحے عثمان کو بنکٹ راؤ گارڈ اندر کونے میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے بابا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت چھ بجے تھے اور بنکٹ راؤ کو سوا چھ بجے والی گارڈی

لے کر بمبئی جانا تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے وردی بھی نہیں پہنی تھی۔ اور اتنے کم وقت میں وہ اسٹیشن مشکل ہی سے پہنچ سکتا تھا۔ بابا نے بنکٹ راؤ کو "سلیمان" کہہ کر مخاطب کیا اور آہستہ سے کچھ کہا۔ اس پر وہ مسکرا دیا لیکن اسی جگہ بیٹھا رہا۔

یہ چاروں بابا تاج الدینؒ کی روشن ضمیری سے بے حد متاثر ہو کر اٹھے۔ عثمان کو تو جیسے چُپ ہی لگ گئی تھی۔ "ڈنڈا رکھ کے سونا، وہ آئیں گے، مار دینا" بابا کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور وہ ان کے مفہوم سے بے خبر تھا۔ پھر سوچنے لگا، ڈنڈے سے کیا بنے گا۔

راستے میں عثمان نے تفصیل سے آسیبی بنگلے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے دوستوں کو بابا صاحبؒ کی ہدایت بتائی کہ ڈنڈا رکھ کر سونا۔ وہ سب حیران رہ گئے اور معمہ حل نہ کر سکے۔ پروگرام بنا کہ پہلے اسٹیشن پر چائے پی جائے اور پھر بھوت بنگلہ کی سیر کی جائے۔

عثمان نے کہا: "میں بنکٹ راؤ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اُسے سوا چھ بجے پسنجر لے کر اٹارسی جانا ہے لیکن وہ تو بابا کے پاس بیٹھا ہے اور واپس آتا نظر بھی نہیں آیا۔ سوا چھ بجنے میں ایک منٹ باقی ہے۔"

فضل الکریم نے بے ساختہ پوچھا: "یہ وہی گارڈ تو نہیں جو دوہری شخصیت کی وجہ سے مشہور رہے۔ بیک وقت بابا کے پاس رہتا ہے اور ڈیوٹی پر بھی۔ سنا ہے بابا صاحب کا خاص معتقد اور فنا فی الشیخ ہے۔"

وہ سیدھے اسٹیشن پہنچے اور پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ اٹارسی پسنجر سیٹی دے کر روانہ ہوئی۔ گارڈ کا ڈبہ سامنے سے گزرا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بنکٹ راؤ وردی میں ملبوس سبز جھنڈی ہلا رہا ہے۔ پھر اس نے انہیں سر کی جنبش سے سلام کیا

اور دور تک مسکراتا رہا۔ بنکٹ راؤ کا اتنے کم وقت میں اسٹیشن پہنچ جانا ان کے لئے معمّا بن گیا۔ پھر ایک ساتھی نے تجویز پیش کی، ہمیں باباجی کے پاس جا کر تمام واقعے کی تحقیق کرنی چاہئے۔ وہ لوگ دوبارہ شکردرا پہنچے۔ فضل الکریم اور عباسی سڑک ہی پر رُک گئے کہ باباجی کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ عبدالغفار اور عثمان نے ہمت کی۔ حجرے میں میلاد شریف کا غلغلہ بلند تھا۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا۔ سلام پڑھا جا رہا تھا۔ باباجی حالتِ وجد میں جھوم رہے تھے۔ اور بنکٹ راؤ ان کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ باباجی کی آنکھیں بند تھیں اور اُن سے اشک رواں تھے۔

معراج : "ارے نوح! درود پڑھو۔ بڑے سرکار کی سواری آ رہی ہے۔" درود کا غلغلہ بلند ہوا اور ایک لطیف سی خوشبو پھیل گئی۔ سلام پڑھا جا چکا تھا۔ باباجی فرش پر بیٹھ گئے اور ذرا فاصلے پر بنکٹ راؤ بھی۔ وہ دونوں حجرے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اس حیرت انگیز مشاہدے کے بعد الٹے پاؤں احاطے کے پھاٹک کی جانب لپکے جہاں تانگے پر ان کے ساتھی منتظر تھے۔ پھر ایک عجیب منظر دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ عباسی اور فضل الکریم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ باباجی خود ان کے سامنے موجود تھے اور ان پر جلال کی کیفیت طاری تھی۔ انہوں نے پلٹ کر حجرے کی طرف دیکھا تو ان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ بابا حجرے میں تھے۔ شاید یہ کوئی دوسرے بزرگ ہوں اسی لمحے باباجی کی جانی پہچانی آواز نے ان کا شبہ دُور کر دیا۔ مگر وہ کب اور کیسے وہاں پہنچے جب کہ راستہ صرف وہی تھا۔ وہ حیرت کی تہوں میں اترتے جا رہے تھے۔

"انگریزی پڑھنے والو! بتاؤ، حضورؐ کو روحانی معراج ہوئی تھی؟" تاج الدین بابا کی آواز میں غصہ غالب تھا: "اب لڑاؤ اپنی سائنس!"

"معاف کر دیجئے باباجی! غلطی ہوئی۔" عبدالغفار نے عاجزی سے کہا۔

وہ فوراً ادھر متوجہ ہوئے۔ ان کی تیوری پر بل تھے اور چہرے پر ملال اور ناگواری کا عکس: "نامعقول، تو پھر آگیا! جا تیرا عہدہ گھٹا دیا۔"

ان کے بپھرے تیور دیکھ کر عثمان عبدالغفار کی اوٹ میں دبک گیا۔ اس کی سراسیمگی دیکھ کر بابا کو ہنسی آگئی۔ "تو کاہے کو ڈرتا ہے عثمان! ڈنڈا رکھ کے سوجا۔ ... سلیمان کی ٹوہ نہ کرنا، اپنی ٹوہ لگانا۔ پھر سمجھ میں آجائے گا معراج کس کو کہتے ہیں!"

اس رات بھوت بنگلے کا پروگرام ملتوی کرکے وہ تینوں کالج ہوسٹل چلے گئے۔ اور عثمان بنگلے واپس آگیا۔ اس رات کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

بھیانک رات : اگلی صبح عثمان اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ چوتھے بنگلے کے ڈاکٹر چودھری کی تختی اس نے پہلے بھی دیکھی تھی جس پر خاصے موٹے حروف میں اس کی ڈگریاں کندہ تھیں۔ مگر اس وقت وہ ساری ڈگریاں ایک خوبصورت چہرے کی اوٹ میں چھپ گئیں۔

"ٹامی، ٹامی!" ایک باریک نسوانی آواز بلند ہوئی۔ اس نے ایک چھوٹے سے کتے کو دُم ہلاتے دیکھا۔ پھر وہ خوبصورت چہرہ اندر چلا گیا۔ اس خاتون کا ذکر اس سے کسی دوست نے کیا تھا۔ اس کا نام للیتا دیوی تھا۔ وہ ڈاکٹر چودھری کی بیوی تھی اور ڈاکٹر چودھری ریلوے میں اچھے مشاہرے پر ملازم تھے۔

اس رات دو بجے کے قریب اچانک عثمان کی آنکھ کھلی۔ باہر احاطے میں قدرے منحنی آواز میں وحشت خیز قہقہہ بلند ہوا۔ کسی کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر بجلی کی طرح اسے بابا کے الفاظ یاد آئے۔ عثمان نے ڈنڈا سنبھالا۔ ٹارچ اٹھائی اور جی کڑا

کرکے دروازے کا پٹ کھول دیا۔ برآمدہ بالکل سنسان تھا۔ ٹارچ کا رُخ بڑے لان کی طرف مڑا تو سوکھے گملوں کی اوٹ میں دو سُرخ سُرخ انگارے چمکے اور غائب ہوگئے۔ اُسے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور دہشت سے جھرجھری آگئی۔ وہ اندر آیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ کمرے کے اندر ہیبت ناک چیخ بلند ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ڈنڈا مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر دس منٹ بعد چھت کی پُراسرار آوازیں اچانک مدھم ہوگئیں۔ عثمان کی نظر روشندان کی ڈوری پر چلی گئی۔ وہ ہل رہی تھی۔ بالائی سرے پر کوئی چیز رسّی سے لپٹی نظر آئی۔ دُھندلا اور پراسرار ہیولیٰ رسی پر سرکتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ اس کے تعاقب میں ویسا ہی ایک اور سایہ دکھائی دیا۔ وہ رسّی کے سہارے فرش پر اترے اور سرکتے ہوئے چارپائی کی جانب بڑھے۔ عثمان نے تاک کر دونوں کے سر کچل دیے۔ اور اسی لمحے بابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "کیا اور بھی آئیں گے؟" وہ سوچنے لگا۔

سانپوں کے مرجانے کے بعد صبح تک کوئی پراسرار آواز نہ آئی۔ چڑیاں چہچہانے لگیں۔ عثمان اٹھا۔ لباس تبدیل کیا۔ اور مردہ سانپ وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ چند چڑیاں برآمدے میں بکھرے ہوئے زرد چاول چگ رہی تھیں۔ احاطے میں آیا تو رات کے پراسرار قہقہے اس کے ذہن میں اجاگر ہوگئے۔ گملوں کی اوٹ میں جدھر دو انگارے سے چمکے تھے، اُدھر نگاہ دوڑائی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خشک اور ویران لان میں خون کے تازہ دھبّے دکھائی دیے۔ اس کے قدم رُک گئے۔ دوسری جانب سے لمبا چکر کاٹ کر گیٹ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ وہاں ایک تانگہ آکر رُکا۔ آنے والے عبدالغفار اور فضل الکریم تھے۔

عثمان نے ان کو سارے واقعات سنائے اور جائے وقوع دکھائی۔ فضل الکریم نے بنگلے کا بغور جائزہ لیا۔ اور سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع بھنگیوں کی بستی میں پہنچا۔ وہاں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بھگوت نامی بھنگی کا کتا غائب ہے۔ فضل الکریم نے بستی کے مکینوں کو بتایا کہ کتے کو کسی نے مار دیا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ اس کتے کی شرارتوں سے تنگ آ کر اُسے بستی سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ اور اس نے ایک مرگھٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ رات گئے مرگھٹ سے لوگوں کے گھروں میں آ کر چیزیں چرائے جاتا تھا۔ وہ ہنڈیا لے کر بھاگ جاتا اور ہنڈیا کو زور سے زمین پر مار کر توڑ دیتا اور کھانا کھا لیتا تھا۔ اس انکشاف سے سب کو پتہ چلا کہ بھوت بنگلے میں پائی جانے والی ہنڈیا اور چاول بھگوت کے کتے کی کارستانی تھی۔ فضل الکریم سب کے ساتھ دوبارہ بنگلے آیا۔ اور وہاں خون کے دھبوں کے قریب پائے جانے والے نشانات کو دیکھ کر بتایا کہ ان ہی نشانات کی وجہ سے اس کا ذہن بھوت بنگلے کے واقعات کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا ہے۔ فضل الکریم نے انکشاف کیا کہ وہ نشانات لکڑ بگّے کے پیروں کے ہیں جو کتے کا گوشت شوق سے کھاتا ہے۔ اور پھر ایسی آواز نکالتا ہے جیسے قہقہہ بلند ہوتا ہے ہوا یہ کہ پہلی دو راتیں کتے اور لکڑ بگّے میں کشمکش ہوتی رہی اور پھر کتا قابو میں آگیا۔ انسانی ہاتھ بھی کتا ہی مرگھٹ سے اٹھا لایا تھا۔

فضل الکریم باتیں کرتے کرتے یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ اور غور سے بنگلے کا چھپّر دیکھنے لگا۔ ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر عمارت کے گرد ایک چکّر لگایا۔ اور واپس آ کر پُراسرار انداز میں گویا ہوا۔ جلدی سے ایک سیڑھی اور دو تین جھاڑو کا بندوبست

کر ڈالو۔

سیڑھی ڈاکٹر چودھری کے بنگلے سے مل گئی۔ فضل الکریم نے چھت گیری ادھیڑ کر علیحدہ کر دی۔ گرد کی موٹی تہ غبار کی شکل میں کمرے میں پھیل گئی۔ چھپّر اور چھت گیری کے درمیانی خلا کی صفائی مدت سے نہ ہوئی تھی۔ مختلف پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور چھپکلیاں بڑی تعداد میں رینگ رہی تھیں۔ فضل الکریم نے سارے آشیانے اجاڑ دیے۔

دو روز گزر گئے اور کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ دہشت کا احساس زائل ہوتا رہا۔ پھر عثمان کا اعتماد مکمل طور پر بحال ہو گیا۔ تاہم اس کے ذہن میں ایک نامعلوم سی خلش موجود تھی۔

بڑا دیو: ایک شام وہ کالج ہاسٹل سے لوٹ رہا تھا کہ بابا جی تانگے میں آتے دکھائی دیے۔ وہ گھبرا کر ایک درخت کی اوٹ میں چھُپ گیا۔ تانگہ قریب آ کر رک گیا۔ بابا جی نیچے اترے اور اسی طرف چل دیے جہاں عثمان درخت کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ عثمان تھر تھر کانپنے لگا۔ بابا جی کو ہنسی آ گئی۔ "او عثمان! اب کاہے کو چھپا رے، سانپاں تے مر گئے۔ اب کاہے کو ڈرتا، نکو ڈرتے رہے، تاج الدین سے نکو ڈرتے۔ اللہ سے ڈرتے۔"

عثمان نے ادب سے سلام کیا۔ بابا جی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ ہی تانگے میں بٹھا لیا۔ اور شکردرا کی طرف چل دیے۔

آبادی سے گزرے تو معتقدین کے ایک ہجوم نے تانگہ گھیر لیا۔ مجبوراً بابا جی نیچے اتر آئے۔ حاجت مندوں کو دعائیں دیتے، جھڑکتے، حالتِ جذب میں مسکراتے،

خفا ہوتے اور عثمان کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتے رہے۔ شکر دراُنگ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

معتقدین کے جلو میں بابا اور عثمان راجہ رگھوجی کے محل میں داخل ہوئے اور اس چھوٹے سے مندر کا رُخ کیا جہاں تین دن پہلے سالانہ میلہ لگا تھا۔ چہل پہل ابھی باقی تھی بابا جی کو دیکھ کر دو تین پنڈت ہاتھ جوڑے باہر نکل آئے۔ باباجی نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہارا بڑا دیو بڑا میلا کچیلا اور گندا لگتا جی۔ میں اسے نہلا دوں؟"

"نہیں بابا! آپ دُیا کریں۔ ہم آپ ہی اشنان کرا دیں گے۔" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا۔

"بابا کو نہلانے دیتے رہے! تم پنڈتاں رگھوجی کی اور اپنی لٹیا ڈبو کر دم لو گے۔ تاج الدین کی بات نان لیتے رہے!"

"نہیں بابا!" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ بابا ہنس کر آگے بڑھ گئے۔ اور پھر آہستہ سے بڑبڑائے "عثمان! تو ان کے مہادیو کو ضرور نہلا نا رے۔"

عثمان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پنڈتوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عثمان کو بعد میں معلوم ہوا کہ بابا پہلے بھی ایک بار اسی طرح مندر میں آئے تھے اور ان کی اس بات پر ہندو بگڑ گئے تھے لیکن کسی کو الجھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

اسی احاطے میں راجہ رگھوجی نے لوہے کے کٹہرے میں شیر پال رکھا تھا۔ بابا کی نگاہ اس پر گئی تو بولے "ارے، اسے کیوں بند کر رکھا ہے؟ بے چارہ پریشان ہو رہا ہے نا۔ کنبے سے بچھڑ گیا، کتا بن گیا۔ نامی، نامی!"

عثمان چونک پڑا۔ ڈر کے مارے اس کا سانس پھولنے لگا اور جسم پر رعشہ طاری

ہو گیا۔ بابا نے بڑھ کر پنجرے کا پھاٹک کھول دیا۔ شیر باہر نکل آیا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف بابا کا خادم پہلوان، بنکٹ راؤ اور عثمان رہ گئے۔ بابا نے کہا۔ "بڑا اچھا کتا ہے۔" پھر عثمان سے مخاطب ہوئے۔ "پنجرے میں پھنستا تو شیر کتا بن جاتا نا۔ تو بھی نامی بنے گا عثمان اور بڑے دیو کو نہلائے گا؟"

اس براہِ راست خطاب سے عثمان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر گھگی بندھ گئی۔ اس کی نظریں شیر پر جمی ہوئی تھیں مگر بنکٹ راؤ ہر بات سے بے نیاز صرف باباجی کو دیکھ رہا تھا۔ باباجی شیر کو چمکارتے ہوئے اپنے حجرے تک لے گئے۔

کسی نے راجہ رگھوجی کو خبر کر دی۔ وہ رائفل سنبھالے دوڑا آیا۔ اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ شیر باباجی کے قدموں میں بیٹھا ہے۔

"او نالائق! اب کاٹے کو آیا۔ کتے کو پنجرے میں ڈالتے تو بھوکا نکو رکھتے، تیرے کو بھی پنجرے میں بند کر دوں؟"

"نہیں باباجی!" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "آپ اسے کٹہرے میں بند نہ کیجیے، لوگ ڈر رہے ہیں۔"

"یہ آپی بند ہو جائے گا۔ کل سے بھوکا ہے۔ تو اس کے کھانے کا بندوبست کر۔"

"میں ابھی بندوبست کرتا ہوں باباجی مگر......"

"مگر وگر کچھ نہیں۔" بابا بگڑ بیٹھے اور پھر شیر سے مخاطب ہوئے۔ "جا رے جا، تیرا راتب مل جائے گا۔ اپنے پنجرے میں انتظار کر۔"

شیر نے حکم کی فوراً تعمیل کی رگھوجی کو تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ شیر واقعی چوبیس گھنٹے

سے بھرا کا تھا۔ گوشت کا انتظام جس آدمی کے سپرد تھا، وہ بغیر بتائے چھٹی کر گیا تھا۔
عثمان چپکے سے واپس آگیا اور بابا کے پاس دوبارہ نہ جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

زہریلی چھپکلی : ایک دن عثمان کالج ہوسٹل پہنچا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے تاج الدین بابا ادھر سے گزرے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈھاک کے پتے کا دونا تھا۔ سیدھے ہندوؤں کے میس میں آئے اور رسوئی میں گھس گئے۔ ہندوؤں کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ چند متعصب طلبہ بہت طیش میں آئے مگر بابا کا احترام ان کے ارادوں میں حائل ہوگیا۔ بابا نے کڑاہی نما سالن کا پتیلا کھولا۔ پھر فوراً پلٹے اور چیختے چلاتے ڈائننگ ہال کی طرف لپکے۔ ایک جٹا دھاری برہمن کے ہاتھ سے نوالہ چھین لیا اور کڑاہی کا پیالہ اٹھا کر فرش پر انڈیل دیا۔ "یہ نکو کھاتے رے، نکو کھاتے۔" وہ زور زور سے کہتے رہے: "سب پھینک دو!"

یہ پہلی تھالی تھی جو ہال میں کھانے کے لئے لائی گئی تھی۔ لڑکے بابا کی حرکتوں پر خفا اور حیران تھے لیکن وہ برہمن لڑکا اچھل پڑا جس کے قریب پیالہ انڈیلا گیا تھا۔ سالن میں زہریلی مُردہ چھپکلی پڑی تھی۔

بابا وہاں سے سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جہاں عبدالغفار اور فضل الکریم بیٹھے تھے۔ ہاسٹل میں مسلمانوں کے لئے کھانے کا بندوبست نہ تھا۔ وہ اپنے ایک اور ساتھی کا انتظار کر رہے تھے کہ کھانا باہر جاکر کھائیں۔ بابا کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ادب کے ساتھ سلام کیا۔ بابا نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دونا ان کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں چھ گلاب جامن تھے۔ ان میں سے دو گلاب جامن فضل الکریم اور عباسی کو دیے ہی تھے کہ دس بارہ ہندو لڑکوں کا

جتھا دوڑتا ہوا آیا۔ برہمن لڑکا سب سے آگے تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر باباؒ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ عین اسی لمحے باباؒ نے دو گلاب جامن عبدالغفار کو دیتے ہوئے کہا۔ "چھپکلی نکو کھاتے رے، گلاب جاماناں کھاتے، اپنا رتبہ گھٹاتے جی۔" پھر وہ فضل الکریم سے کہنے لگے۔ "عیباں نہیں ڈھونڈتے جی، عیباں چھپاتے، بروں کو اچھا بناتے، ان کے ساتھ برے نکو بنتے۔"

ان کی بے ربط باتوں کا مفہوم کوئی اور نہ سمجھ سکا۔ باباجیؒ پھر چوبے کی جانب متوجہ ہوئے۔ "مسلمان کا جھوٹا نکو کھاتے۔ گلاب جاماناں نکو کھاتے۔ چھپکلیاں کھاتے کیوں رے نالائق؟"

"نہیں بابا۔" چوبے کی زبان سے نکلا اور اس کا رنگ زرد پڑگیا۔ "نہیں بابا، چوبے آپ کا جھوٹا تو شوق سے کھائے گا۔" یہ کہتے ہوئے عبدالغفار نے ایک گلاب جامن چوبے کو پیش کیا۔ وہ آداب بجا لایا اور منہ میں رکھ لیا۔ باباؒ نے مسکراتے ہوئے عبدالغفار کی طرف دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔

دوسرے ہندو لڑکوں نے بھی باباؒ کو گھیر لیا اور خوشامد کرنے لگے کہ ہمارے پاس ہونے کی دعا کریں۔

"جاؤ رے جاؤ نالائقو! سب پاس ہوگئے۔" انہوں نے فقط اتنا کہا اور تانگے پر سوار ہو کر چلے گئے۔

عثمان نے یہ تفصیل سن کر اندازہ لگایا کہ باباؒ بہت اچھے موڈ میں ہیں۔ ان سے ملنا چاہیئے۔ صرف فضل الکریم نے ساتھ دیا۔ وہ اُن سے ملنے چلے۔

دلی بنادو: اسی اثنا میں بابا تانگے پر سوار آتے نظر آئے۔ عثمان کے

قدم رُک گئے۔ باباجیؒ نے اُسے اپنے ساتھ لیا۔ اور سیدھے شکردرا روانہ ہوگئے۔

محل کے احاطے میں پہنچ کر عثمان کا ہاتھ پکڑے وہ پھر مندر کی طرف گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ باباجیؒ کی آواز ابھری۔ "بڑا دیو گندا ہے رے۔ مکھیاں بھنکتیں، اس کو نہلائے گا، ہے نا!"

"نہیں بابا!" عثمان کی زبان سے یوں ہی نکل گیا۔ باباؒ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"کاہے کو ڈرتا رے۔ چل میرے ساتھ۔ ٹوٹے دھاگے بھی جڑ جاتے۔"

مندر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کٹہرے کی اوٹ سے رگھوجی اور شہر کے کوتوال جبار خاں نمودار ہوئے۔ باباجیؒ کو دیکھتے ہی رگھوجی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ مندر کے دو تین پجاری بھی نکل آئے اور ہاتھ جوڑ کر باباکو دیکھنے لگے۔ باباؒ ہنس دیئے اور اور جبار خاں سے مخاطب ہوئے۔ "ارے بڑے کتے تو کاسے کو آیا رے، شیر بنے گا، پنجرے میں بند ہوگا، کیا کھائے گا رے؟"

"بابا ولی بنا دو!" کوتوال کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

وہ چونک کر بولے۔ "بہت بھوکا ہے رے۔ مگر ولی تو یہ بچہ ہے۔" انہوں نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔ جبار خاں تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ زبان سے اللہ ہُو کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ باباؒ سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ دس منٹ اسی عالم میں گزر گئے تو رگھوجی گھبرا اٹھا۔ باباؒ نے سر کو دوبارہ جنبش دی۔ کوتوال ہوش میں آگیا۔ لیکن آنکھیں اب بھی انگارے کی طرح سُرخ تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"اب اس کا پیٹ بھرا۔ کئی دن کا بھوکا تھا جی۔ بہت بھوکا ہے۔" پھر وہ حجرے کی طرف چل دیے۔ راجہ نے رکتے رکتے کہا۔ "کوتوال صاحب کے ساتھ چیف کمشنر، سر نجمن رابرٹس آئے ہیں۔ میرے محل میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اجازت ہو تو بُلا لاؤں۔"

"بُلالے رے، بُلالے بندر کو۔ بےچارہ پریشان ہے۔ تاج الدین کسی کو نکو روکتا جی۔"

عثمان بنکٹ راؤ کے قریب بیٹھا تھا۔ پہلوان باباکی مٹھیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کے ہمراہ سر نجمن ننگے پاؤں حجرے میں داخل ہوا۔ باباجی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "ارے بندر، تو کاہے کو اتنا خرچہ کیا! بچی کو ناحق تکلیف دیا۔ بٹیا کو مٹی سونگھا دیتے رے، اچھے ہو جاتے۔"

کوئی نہ سمجھ سکا کہ بابا کیا کہہ رہے ہیں۔ عثمان کی نگاہ دروازے کی جانب اٹھی۔ جوتوں کے قریب کوتوال بیٹھا نظر آیا۔ اس پر ابھی تک لرزہ طاری تھا۔ اور آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ وہیں رانی، سر نجمن کی میم اور جواں بسال بیٹی کھڑی تھیں۔ بابا نے ان کو دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ خواتین کا بڑا احترام کرتے تھے۔ رانی کو بیٹی بنا رکھا تھا اور اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔

"آجاؤ رے اندر آجاؤ۔ باہر کاہے کو کھڑے ہو!" وہ ان سے مخاطب ہوئے۔ رانی نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ پھر رانی لڑکی کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھی۔ لڑکی کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

"بابا! اس کے سر میں درد رہتا ہے۔ لندن میں کسی علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ سر نجمن

نے اسے آپ سے دم کرانے کے لئے وہاں سے بلوایا ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں پوری بات کہہ گئی۔

"یہ بندر تو پگلا ہے جی۔ بچی کو تکلیف دیا۔ تاج الدین کو بولنا تھا۔" پھر بڑے پیار سے اُسے اپنے قریب بٹھایا۔ "پریشان نکو ہوتے بیٹی۔ مٹی سونگھ لیتے، اچھے ہو جاتے۔ پٹی کھول دیتے۔" شفقت اور مٹھاس ان کے لہجے سے پھوٹی پڑتی تھی۔

لڑکی نے کچھ بھی نہ سمجھا۔ وہ اردو سے ناآشنا تھی۔ حیرت بھری نگاہوں سے بابا کو دیکھ رہی تھی۔

"کون سی مٹی؟" رگھو جی نے پوچھا۔

"یہ بندر لائے گا جی۔ سڑک کی مٹی لائے گا۔ بچی کو سونگھا دیتے جی۔ اچھے ہو جاتے۔" سر نجمن رابرٹسن بابا کی خدمت میں پہلے بھی حاضری دے چکے تھے۔ بات سمجھ گئے۔ فوراً سڑک سے تھوڑی سی مٹی لے آئے اور بچی کو اسے سونگھ لینے کی ہدایت کی۔ مٹی سونگھتے ہی لڑکی کو تین چار چھینکیں آئیں اور ہر چھینک کے ساتھ اس کی ناک سے ایک کیڑا گرا۔

"بس بیٹی بس۔ اب اچھے ہو گئے۔" بابا نے پورے اعتماد سے کہا۔

رانی نے اس کے سر کی پٹی کھول دی۔ سر کا درد بالکل غائب ہو گیا۔ فرطِ مسرت سے لڑکی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ سب کے سب سراپا شکر و سپاس بنے ہوئے تھے۔ لڑکی کے اشارے پر سر نجمن نے احساسِ تشکر کے ساتھ باباجی کی خدمت میں کثیر رقم پیش کی۔ تو اُن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مگر ان کے الفاظ میں بڑی نرمی تھی۔ "تو میری بیٹی ہے بیٹی باپ کو نذرانہ نہیں دیتی۔ باپ بیٹی کو دیتا ہے۔" یہ کہا اور گاؤ تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

چند سکے لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے خوشی خوشی تحفہ قبول کر لیا اور پھر وہ شاداں و فرحاں رخصت ہو گئے۔

ادھر کوتوال جبار خاں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آگیا۔ وہ ساری رات اللہ اللہ کی ضرب لگاتا رہا۔ دوسرے دن گھر کا سارا سامان لٹا دیا اور درویشی اختیار کر لی۔ سر نجمن نے کچھ عرصے اسے تحفظ دیا مگر پھر کوشش کر کے وقت سے پہلے ہی پنشن دلوا دی۔

احسان: لوگ نہیں جانتے کہ سی پی کے مسلمانوں کی زیادہ تر فلاح و بہبود حضرت تاج الدین بابا کی رہینِ منت ہے اور پورے صوبے پر ان کا زبردست احسان ہے۔ سر نجمن کی یہی ملاقات مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔ انہوں نے بڑی تعداد میں اسکول اور مدرسے قائم کر کے تاج الدین بابا کا فیضان عام کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی درسگاہوں کے لئے زمینیں فراہم کیں، عمارتوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور تعلیم یافتہ مسلمان جوانوں کے لئے روزگار فراہم کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبل پور کے مسلمانوں کا اسکول آج بھی رابرٹسن انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے نام سے موجود ہے۔ انہوں نے وہاں ہزاروں مخالفتوں کے باوجود رابرٹسن کالج بھی قائم کیا۔ ناگ پور کا انجمن اسلامیہ ہائی اسکول بھی سر نجمن اور تاج الدین بابا کی اسی ملاقات کی یادگار ہے۔

کالج ہاسٹل میں چھپکلی والے واقعے کے چند روز بعد امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ سارے ہندو اور تینوں مسلمان طلبہ کامیاب قرار دیے گئے جن کی اس روز باباجی سے ملاقات ہوئی تھی۔ فضل الکریم، عباسی، عبدالغفار اور چوبے جنہوں نے باباجی کے دیے ہوئے گلاب جامن کھائے تھے، درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔

نتیجے کے دوسرے ہی دن سر نجمن نے انہیں طلب کر لیا۔ صرف فضل الکریم اور

عباسی پہنچ سکے۔ عبدالغفار اور چوبے اپنے گھر جا چکے تھے۔ مسٹر نجمن نے ان دونوں ۔ تحصیل دار مقرر کر دیا اور دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ وہ اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔

چند روز بعد عبدالغفار اور چوبے بھی پہنچ گئے۔ نائب تحصیل دار مقرر کئے گئے مگر خالی جگہیں نہ ہونے کے باعث سالہا سال کی ملازمت کے باوجود تحصیلداری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ مسٹر نجمن کا تھوڑے ہی عرصے بعد تبادلہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے جانشیں کمشنر صاحب سے یہ کہتے گئے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔

دعا اور ترقی : ایک شام چائے پر عبدالغفار، چوبے اور نورس بھی موجود تھے چوبے ناگ پور میں تعینات تھا اور عبدالغفار کو ساگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔ للیتا نے عثمان سے کہا کہ وہ باباصاحب سے دعا کرائے کہ ڈاکٹر چودھری کی پریکٹس چل نکلے۔ چائے کے بعد عبدالغفار کے علاوہ سارے مرد باباجی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

باباحجرے میں تھے اور ان پر استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ عالمِ حواس میں آگئے۔ عثمان پر نگاہ پڑتے ہی ان کا چہرہ شاداب ہو گیا۔ "ارے عثمان! تو اتنے دن سے کیوں نہ آیا؟ دیوتا میلا ہو رہا نا۔ اس کو نہلاتا کائے نا۔"

وہ اٹھنے لگے ۔ اور اس روز عثمان کو رگھو جی کی جگہ لینا پڑی۔ "نہیں بابا۔ آپ بیٹھے رہیں۔ ادھر نہ جائیں۔ رگھو جی خود نہلا دیں گے۔"

"رگھو جی نکو نہلا سکتا رے، نکو نہلا سکتا۔ تو کائے کو ڈرتا۔ پھر کائے کو آیا رے، کائے کو آیا۔ جا اپنا راستہ لے۔"

عثمان نے پہلی بار بابا کے سامنے زبان کھولی تھی۔ وہ ان کی خفگی پر گھبرا کے چپ ہو گیا۔

فضل الکریم نے بات کا رُخ بدل دیا۔ "باباجی! یہ ڈاکٹر چودھری اور نورس آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اور یہ چوبے سلام کے لئے حاضر ہوا ہے۔"

"سلام کرنے نکو آیا رے۔ بولتا گلاب جامن سے پیٹ نکو بھرا۔ پیٹ میں درد ہو جائے گا رے۔ چپکلی نکو کھاتے رہے۔ تو کھائے گا عثمان؟"

عثمان جھینپ گیا۔

"ڈاکٹر پیٹ کے درد کا علاج کرتا نا۔ زیادہ کھانے سے درد ہو جاتا۔ بندر اچھا رے۔ جھنڈی دکھاتا۔"

ان پر پھر جذب کا غلبہ طاری ہو گیا۔ وہ سب بت بنے بیٹھے رہے۔ پھر فضل الکریم کے اشارے پر اٹھ کر باہر آگئے۔ اس نے سمجھایا کہ اس کی بات کا جواب مل چکا ہے۔ مگر چوبے کا اصرار تھا، نہیں ایک بار پھر بابا کے پاس جانا چاہئے۔ نورس نے کوئی رائے نہ دی اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ بابا خود حجرے سے برآمد ہوئے۔ وہ لوگ سہم گئے۔

"تو ابھی تک نہیں گیا رے عثمان، بابا کی بات نہیں مانتا نا۔" اس بار ان کا لہجہ نرم تھا۔ "اور بندر تو سلام کرنے آیا تھا۔ تاج الدین کی دعا لیتا جا، نالائق!"

عثمان اور نورس کو وہ اپنے حجرے میں لے آئے۔ "اچھا بندر ہے جی، اچھا ہے۔ ایمانداری سے کام کرتا۔ عثمان! اس کو جامن کھلا نا رے اور کیا مانگتا رے بندر؟"

"کچھ نہیں بابا۔" نورس نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ بابا نے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اور پھر انہیں رخصت کر دیا۔

نورس اور عثمان گھر پہنچے۔ کھانے کی میز پر دو عدد گلاب جامن دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ملازم نے بتایا کہ نیکٹ راؤ کا لڑکا دے گیا ہے۔ ان کے گھر نیاز دلائی گئی تھی۔ یہ اس کا تبرک ہے۔

"نیاز کیسی! وہ تو ہندو ہے۔"

"ہندو ہونے کے باوجود ہر جمعرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیاز دلواتا ہے۔"

باباجی کی ہدایت کے مطابق عثمان نے گلاب جامن نورس کو اصرار کے ساتھ کھلا دی۔ کھانے کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی ترقی کے احکام آگئے اور وہ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ہوکر بمبئی چلا گیا۔

فضل الکریم ایم۔ اے۔ سی کے عہدے پر فائز ہوکر بلاسپور کی طرف کوچ کر گیا۔ بمبئی سے عثمان کی ترقی کا آرڈر آیا تو وہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ لوگوں کا خیال تھا اُسے باباجی کی دُوری گوارا نہ ہوگی۔ اور وہ ناگ پور نہ چھوڑے گا۔ مگر اس کے لئے اس تاثر کے خلاف عمل کرنا بہت دشوار ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر چودھری ہنوز ترقی کی راہ تک رہا تھا۔ پھر اچانک راجہ بلاسپور کے یہاں سے اس کے لئے بلاوا آگیا۔

گاڑی پر سوار ہوتے وقت چودھری کی نگاہ نیکٹ راؤ پر جا پڑی۔ وہی اس گاڑی کا گارڈ تھا۔ اگلے اسٹیشن پر وہ اس کے پاس آیا اور باباجی کا پیغام دیا: "مریض کو کھریا کھلانا۔"

ڈاکٹر چودھری کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ تاہم وہ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ اور مریض کو اپنے ساتھ واپس لے آیا۔ وہ راجہ صاحب کا بھتیجا اور ہونے والا داماد تھا۔ اس کے پیٹ میں اس قدر شدید درد ہوتا کہ وہ تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہوچکے تھے۔

چودھری نے دو تین روز علاج کیا مگر مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی دوران نیکٹ راؤ نے ایک بار پھر بابا کا پیغام یاد دلایا۔ تب اس نے کھریے کا سفوف کھلانا شروع کیا اور آٹھ دس روز میں مریض مکمل صحت یاب ہوگیا۔

اس کارنامے سے چودھری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور وہ بڑے معقول مشاہرے پر راجہ صاحب کا ذاتی معالج مقرر ہوگیا۔ تین مہینے کے اندر اندر اس کی پریکٹس اس قدر بڑھ گئی کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ رہی۔

عثمان اس ماحول میں اجنبی نظر آتا تھا۔ اس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ اور اس نے وہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ ایک روز وہ فضل الکریم کے پاس بلاسپور پہنچا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا اور زبردستی اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔

دیو کا راز: دونوں رات بھر باتیں کرتے رہے۔ فضل الکریم نے حیرت انگیز انکشافات کئے۔ باتوں ہی باتوں میں بھوت بنگلے کا ذکر چھڑ گیا۔ فضل الکریم نے کہا: "میں نے اس بنگلے میں وقوع پذیر ہونے والے سارے واقعات کا کھوج لگا لیا ہے۔ تاہم ایک دو کڑیاں باقی ہیں۔ تمہیں اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتانا ہوگا۔ باباجی کی بات سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ بھونسلہ خاندان سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔"

عثمان نے اعتراف کرتے ہوئے بتایا: "ہمارے پردادا نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کا تعلق چھوٹا ناگ پور کے مرہٹہ خاندان سے تھا۔"

فضل الکریم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور اس نے نہایت قدیم دستاویز نکالتے ہوئے کہا: "شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ راجہ رگھوجی کی جاگیر حال ہی میں کورٹ آف وارڈ سے واگذار ہوئی ہے۔ گورنمنٹ نے مجھے اس کا کسٹوڈین مقرر کیا اور اس سلسلے میں

گزشتہ ماہ مجھے بمبئی جانا پڑا۔ رگھو جی کا محل قرضوں کی وجہ سے بحق سرکار ضبط ہو چکا ہے۔" فضل الکریم نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: "شاید تمہیں علم نہ ہو رگھو جی کی اس وقت کوئی اولاد نہیں ہے۔ اور اس کے خاندان کے سارے افراد انگریزوں نے پہلے ہی تہ تیغ کر دیے ہیں۔ لیکن راج کمار روپوش ہو چکا تھا۔ اس کا سراغ نہیں مل سکا۔" یہ کہہ کر اس نے دستاویز پر ایک جگہ انگلی رکھ دی اور عثمان سے پوچھا: "تمہارے پردادا کا سابقہ نام یہ تو نہیں تھا؟"

عثمان نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا: "غالباً ہماری دادی یہی نام بتاتی تھیں۔"

فضل الکریم نے تقریباً اچھل کر اپنے جذبات ظاہر کیے: "عثمان! تم نے بابا کی بات نظر انداز کر کے اور مندر کے بت کو غسل نہ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے ورنہ رگھو جی کے ساتھ تمہارے بھی دن پھر جاتے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔ افسوس!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کریم! میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔" عثمان بھونچکا سا رہ گیا۔

فضل الکریم نے بتایا: "رگھو جی کے مال و اسباب کی قرقی اور ضبطی کے دوران یہ دستاویز کمشنر کے ہاتھ لگی۔ اس میں یہ بھی درج تھا کہ مندر اور مہادیو کا بت کہاں ہے۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ اس نے سراغ لگا لیا۔ راجکمار بالاجی فرار سے پہلے دو روز پجاریوں کے بھیس میں محل کے احاطے والے مندر کے اندر روپوش رہا۔ اس نے پہرہ بٹھا کر مہادیو کے بت کو غسل دیا۔ سیندور کی موٹی تہ اتروا دی۔ اس سے بت کی پشت پر کھدی ہوئی وہ تحریر ابھر آئی جس میں دفینے کے مقام کی نشان دہی کی گئی تھی۔"

عثمان نے دستاویز کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اسے یاد آیا کہ اسی تحریر اور دستخط کے چند پرانے کاغذات اس نے پردادی کے صندوقچے میں دیکھے تھے۔ گرچند ہی روز پہلے گھر کی صفائی کرتے وقت وہ سب کباڑیے کو بیچ دیے تھے۔

فضل الکریم نے اپنا سر پیٹ لیا: "یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ اب تم اپنا استحقاق ثابت نہیں کر سکتے۔ میری تمام کوششیں بے کار گئیں۔ میں نے تمہاری خاطر یہ دستاویز ریکارڈ سے اڑا کر اپنی تحویل میں لے لی تھی حالاں کہ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔" پھر اس نے دستاویز کو پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا: "اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مرحلے پر بنگلے کے آسیب کا راز بھی بتایا جا سکتا ہے۔"

اور پھر حجاب در حجاب پردے اٹھنے لگے۔

"بھوت بنگلہ ہرگز آسیب زدہ نہ تھا۔ تم نے جو سانپ مارے تھے وہ ناگ تھے۔ دراصل رات کی تاریکی میں وہ چھت گیری اور چھپر کے درمیانی خلا میں گھس جاتے اور وہاں بسنے والے پرندوں کے انڈے بچے کھا جاتے۔ پرندے شور مچاتے اور چیخ کر اڑ جاتے۔ رات کے سناٹے میں ان پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ، گرنے کی پھٹاپھٹ اور ملی جلی چیخ پکار کا شور گونجتا تو ماحول اور بھیانک ہو جاتا۔ بھوت پریت کا واہمہ پہلے ہی ذہن پر مسلط تھا اس لئے چھوٹے موٹے ہنگامے کچھ اور ہی صورت اختیار کر لیتے تھے۔"

اللہ اللہ کر کے بیٹھ جاؤ

مدراس کے رہنے والے دیوا جی راؤ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے۔ ان کا کہنا ہے: ایک دن میں سی آئی ڈی سب انسپکٹر عبدالکریم صاحب کے گھر گیا۔ ان کے ہاں کسی بزرگ کی دو تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے پوچھا "جناب! کیا یہی حضرت بابا تاج الدین ہیں۔" انہوں

نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے عبدالکریم صاحب سے ایک فوٹو اپنے لئے بھی مانگا۔ لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ایک ماہ بعد میں بابا صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلنا۔ میں نے ان سے ریل کا خرچ دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: پچاس روپے۔ میں نے مایوسی سے کہا کہ پچاس روپے تو میری تنخواہ ہے۔ اگر میں پچاس روپے سفر خرچ پر صرف کر دوں تو گھر والوں کو کیا دوں گا۔ عبدالکریم صاحب نے کہا تو پھر تم بابا صاحب کے پاس کیسے جاؤ گے؟ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے جواب دیا، میں پولیس میں ہوں۔ گورنمنٹ مجھے ڈیوٹی پر ناگ پور بھیجے گی تو بابا صاحب کے درشن کا موقع مل جائے گا۔ عبدالکریم صاحب نے کہا: تمہاری نوکری مدراس میں مستقل ہے، تمہیں ناگ پور کس طرح بھیج دیا جائے گا؟ میں نے کہا: کچھ بھی ہو، میرا دل چاہتا ہے کہ میں بابا صاحب کے درشن کروں۔ اگر میرا جذبہ صادق ہے تو بابا صاحب خود مجھے بلائیں گے۔

اس واقعہ کو چند روز گزرے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کے لئے ناگ پور کا انتخاب کیا گیا۔ افسر بالا نے عبدالکریم صاحب کو حکم دیا کہ وہ مجھے ساتھ لے کر ناگ پور جائیں۔ عبدالکریم صاحب نے مجھے اس سرکاری حکم سے لاعلم رکھ کر کمشنر کو رپورٹ دی کہ یہ ہیڈ کانسٹبل (یعنی میں) میرے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہے کیوں کہ اسے اختلاجِ قلب کی شکایت ہے۔ لمبے سفر اور محنت کی وجہ سے یہ کام کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ کمشنر صاحب اس درخواست پر بہت ناراض ہوئے اور سختی سے کہا کہ کچھ بھی ہو، یہی ہیڈ کانسٹبل تمہارے ساتھ جائے گا۔

ہم ناگ پور پہنچ کر کانگریس کے جلسے میں شریک ہوئے اور ڈیوٹی انجام دینے

لگے۔ ایک دن مجھے دل کی شدید تکلیف اٹھی۔ میں نے پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں عبدالکریم صاحب سے کہا کہ آپ مجھے مدراس روانہ کر دیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، کل چلے جانا۔ میں اگلی صبح اٹھا تو خیال آیا کہ کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ میں بابا صاحب کے درشن کا آرزومند تھا اور اس کے لئے جان کی بازی لگا کر ناگ پور بھی آ گیا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ میں بغیر ملے واپس جا رہا ہوں۔ پھر سوچا کہ ریل ۱۲ بجے روانہ ہوگی اور سنا ہے کہ بابا صاحب تانگے پر بھی باہر نکلتے ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ راستے میں ان سے ملاقات ہو جائے۔ ابھی میں باہر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ شور اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب تانگے پر بیٹھے آ رہے ہیں اور ساتھ میں لوگ دوڑ رہے تھے۔ میں نے بابا تاج الدینؒ کو پہچان لیا۔ خوشی کے عالم میں ان کی قدم بوسی کے لئے دوڑا اور جوں ہی تانگے کے قریب پہنچا، دل میں شدید درد اٹھا اور قریب تھا کہ میں گر پڑوں بابا صاحبؒ نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا: "ٹھہر جا!" میں رُک گیا۔ گاڑی آگے چلی گئی اور میں گھر لوٹ گیا۔ میں عبدالکریم صاحب کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو میں ان کے ساتھ اسٹیشن جاؤں لیکن وہ نہیں آئے اور میری گاڑی چھوٹ گئی۔ تین بجے کے قریب میں دوبارہ بابا صاحبؒ کے درشن کو نکلا۔ آپ دوبارہ تانگے میں سوار آئے۔ میں نے بابا صاحبؒ کے چہرے پر نظر ڈالی تو ان کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے سوچا نہ جانے کیا وجہ ہے کہ بابا صاحب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ بابا صاحب نے آنکھیں کھول کر فرمایا: "ارے چھورے، ہو جائے گا، اللہ اللہ کر کے بیٹھ جا، نوکری چھوڑ دے۔" میرے دل میں خیال آیا کہ اگر نوکری چھوڑ دوں تو گزر بسر کیسے ہوگی۔ بابا صاحبؒ نے کہا: "ارے کیا پیٹ لگا یارے، تجھے پاؤ پیٹ گنجی دیا رکھ دے کر، اللہ اللہ بول کر گزار دے۔"

میں نے سوچا، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دل کی حالت خطرناک ہے۔ میں تو ایک مہینہ شاید ہی زندہ رہوں۔ بس یہ آخری دن اللہ اللہ کرکے گزار دینے چاہئیں۔

باباصاحب نے ارشاد فرمایا: "ارے ان باتوں کا کیوں خیال کرتا رہے، جا اللہ اللہ کر۔"

میں مدراس واپس آکر چھ سال تک نوکری میں رہا اور پھر پنشن پاکر اللہ اللہ کر رہا ہوں۔ اب نہ میرے دل میں درد ہے اور نہ کوئی دوسری شکایت ہے۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ کہ ایسے لوگ جن کی قوتِ فکر و مشاہدہ تیز ہوتی ہے اور جو حساس طبیعت رکھتے ہیں، اکثر شاعرانہ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ شاعری ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے طویل، مشکل اور گہرے مضامین کو مختصر طور پر اور آسانی سے دوسرے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ جس بات کے لئے نثری صورت میں کئی صفحات درکار ہوتے ہیں۔ شعری لباس میں اسے چند مصرعوں میں مقید کیا جا سکتا ہے۔

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثر حضرات شاعرانہ اندازِ بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ تاریخِ تصوف ایسے کتنے ہی عظیم المرتبت لوگوں کی امین ہے جو عرفان و آگہی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔

حضرت بابا تاج الدین اولیاءؒ نہ صرف شاعرانہ ذوق کے حامل تھے بلکہ شعرگوئی کی صلاحیت بدرجۂ کمال ان کے اندر موجود تھی لیکن بے نیازی اور مزاج میں استغراق کی وجہ سے آپ مروجہ طرزوں میں شاعری کی طرف رجوع نہیں ہوئے۔ جو کچھ بابا صاحب نے کہا اس کو نہ خود ضبطِ تحریر میں لائے اور نہ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ

کوئی اور سنکر لکھ لیتا۔ صرف چند اشعار ریکارڈ میں آسکے۔ باقی کلام لاعلمی اور عدم دستیابی کے اندھیروں میں گم ہو کر رہ گیا۔ بابا تاج الدینؒ داس ملوکا تخلص کرتے تھے جس کے معنی خدا کا بندہ ہے۔ ذیل میں ہم بابا تاج الدینؒ کے اشعار اور ان کے معانی اور مختصر تشریح پیش کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو اشعار کی معنویت سمجھنے میں مدد ملے۔

(۱) اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام
داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

ترجمہ: چوپائے ملازمت نہیں کرتے اور پرندے کاروبار نہیں کرتے پھر بھی رزق ان کو ملتا رہتا ہے۔ داس ملوکا (بابا تاج الدین) کا کہنا ہے کہ دوستو! سب کی پرورش کرنے والا اللہ ہے۔

(۲) مانش ہے سب آتما، مانس ہے سب راکھ
بندی کی گنتی نہیں۔ بندی میں سو لاکھ

ترجمہ: آدمی سب کا سب روشنی (آتما) ہے اور سب کا سب مٹی (راکھ) بھی ہے۔ صفر اگرچہ شمار نہیں کیا جاتا لیکن صفر ہی سے گنتی کی قیمت لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

تشریح: بابا صاحب آدمی کو محض مٹی (گوشت پوست) سے مرکب تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی بظاہر مٹی معلوم ہوتا ہے لیکن مٹی کے ساتھ ساتھ وہ روشنیوں کا مجموعہ بھی ہے۔ ایسا مجموعہ جو کائنات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مایوس کن بات یہ ہے کہ انسان نے خود کو مظاہر (مٹی) کا پابند بنا رکھا ہے۔ اگر انسان اپنی ذات (روشنی) سے واقف ہو جائے تو مظاہر (اسپیس) کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی

مرضی اور اختیار سے مظاہر میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ یہی عرفانِ نفس ہے۔

(۳) دام و دُرکی پرِیس میں رام کرت گُن گائے
پربھو کی سوگند ہے دُشٹ اُسے مل جائے

ترجمہ: ظاہر پرست خدا کی تسبیح اور عبادت کا دکھاوا کرتا ہے۔ اللہ کی قسم! اس کو اللہ تو نہیں مل سکتا، البتہ شیطان اُسے مل جاتا ہے۔

(۴) تن پاپی، من کاہرہ، اُجیارے سب کیس
مندر کا دیپک نہیں، رشیوں کا سا بھیس

ترجمہ: جسم گناہوں سے آلودہ ہے، دل سیاہ ہو چکا ہے۔ ظاہری چیزوں کو سفید بالوں نے چھپا رکھا ہے۔ محض اللہ والوں کا حلیہ بنا لینے سے یا ان کے جیسا لباس پہن لینے سے دل کے اندر روشنی نہیں ہو سکتی۔

(۵) سارے بن کی رات میں بن باسی بن جائیں
داس ملوکا ساتھ میں جاگیں اور لہرائیں

ترجمہ: جنگل کی رات میں سارے آدمی بن جاتے ہیں۔ داس ملوکا (تاج الدین) ان کے ساتھ جاگتے رہتے ہیں اور خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔

تشریح: یہ دوہا اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب بابا صاحب رات کو ریاضت و مراقبہ کی غرض سے بابا داؤد مکی رحؒ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ بابا صاحب کہتے ہیں کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مظاہر بے حس و حرکت ہیں اور ان میں زندگی نہیں ہے لیکن درحقیقت ان میں زندگی کے تمام آثار موجود ہیں۔ شب بیداری کی وجہ سے موجودات کا باطنی رُخ سامنے آجاتا ہے اور تاج الدین رات بھر غیبی مشاہدات میں

مستغرق رہتے ہیں۔

ماہ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ میں باباصاحب معمول کے مطابق گھومنے نکلے اور ڈگوری کے پُل پر بیٹھ گئے۔ حاضرین بھی آپ کے قریب بیٹھ گئے اور اپنی اپنی مشکلات بیان کرنے لگے۔ باباصاحب حضرت فریدالدّین تاجی سے مخاطب ہوئے۔

"تاج العارفین، سراج السالکین، تاج الملوک ۔ جانتے ہو یہ کون ہے؟"

فریدصاحب نے جواب دیا: "آپ کے سوا کون ہوسکتا ہے۔"

باباصاحب نے فرمایا: "ہو بابو۔"

ایک لمحہ توقف کے بعد باباصاحب نے پوچھا: "عید کا چاند دیکھا گیا؟"

عرض کیا گیا: "رمضان کی عید ہوچکی۔ اب عیدالضحیٰ کا چاند دِکھے گا۔"

باباصاحب نے فرمایا: "ہو بابو۔ اب اس کے بعد چاند نہ دِکھے گا۔"

اسی ماہ باباصاحب کی طبیعت قدرے خراب ہوئی جس کی وجہ سے آپ باہر تشریف نہیں لائے۔ ایک دن صبح باباصاحب نے شکردرہ کا وہ گھنٹہ کھولا جو مہاراجہ رگھو جی کے پہرے دار بجایا کرتے تھے۔ اور کہا۔

"یہ گھنٹہ تاج آباد میں بجے گا۔"

تاج آباد اُس زمانے میں ایک غیرآباد اور ویران جگہ تھی جو امرپدر روڈ پر واقع

تھی۔ اس جگہ صرف چند جھونپڑے اور پھونس کی ایک مسجد تھی۔ حضرت فریدالدین صاحب کی ایما پر اس زمین کا نام تاج آباد تجویز ہوا تھا۔

شکردرہ سے بابا صاحب تاج آباد پہنچے۔ اور پھونس کی مسجد میں بیٹھ گئے۔ کھانا طلب کیا۔ اور کچھ کھا کر وہاں سے بیر پیٹھ کی طرف روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے ایک میدان میں بیٹھ گئے۔ مٹھی بھر مٹی اٹھائی، سونگھا اور فرمایا۔

"حضرت! یہ مٹی بہت اچھی ہے۔ ہمارے لئے یہاں بنگلہ بنا دیجئے تو رہیں گے۔"

پھر فوراً ہی فرمایا۔

"ٹکورے چپ، جھونپڑا رہا تو بس۔"

بابا صاحب کی طبیعت گاہے بہ گاہے خراب رہنے لگی۔ آپ کا معمول تھا کہ عیدین کو شہر کی طرف ضرور جاتے تھے۔ خدام بابا صاحب کو قیمتی جبّہ پہناتے اور آپ عمامہ باندھتے۔ اس کے بعد آپ تانگے پر سوار ہو کر ناگپور کی گلی گلی اور سڑکوں پر گھومتے اور لوگوں کو دیدار سے مشرف کرتے۔ اس طرح لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ بابا صاحب کی سواری کو دیکھ کر لوگ دوڑے ہوئے آتے اور سلام عرض کرتے۔ مشتاقانِ دید کی پیاس نہ بجھتی تو تانگے کے ساتھ دوڑتے جاتے۔ بابا صاحب اپنے مخصوص لہجے میں لوگوں سے گفتگو کرتے رہتے۔

اس دفعہ بقر عید کا چاند ہوا لیکن روایت کے خلاف بابا صاحب نے لوگوں کی بہت کوشش اور عرض کے باوجود نہ نیا کپڑا پہنا اور نہ شہر کی جانب گئے۔ نہ صرف عید الضحیٰ بلکہ اس کے بعد پورے مہینے بابا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔ آپ کبھی باہر جاتے اور کبھی نہیں۔

محرم ۱۳۴۲ھ آ گیا۔ بابا صاحب کا معمول تھا کہ محرم کی دسویں تاریخ کو سبز جبّہ زیب تن کر کے شکردرہ سے باہر ایک میدان میں تشریف لے جاتے جو میدانِ کربلا کہلاتا تھا۔ میدانِ کربلا کی یہ حاضری نہایت شان اور دبدبے کی ہوتی تھی۔ سب سے آگے مہاراجہ رگھوجی راؤ ہاتھی پر سوار ہوتے۔ اور ان کے آگے پیچھے سپاہی ہاتھ میں نیزے لئے ساتھ چلتے۔ مہاراجہ کی سواری کے پیچھے حضور بابا صاحب کی بگھی ہوتی تھی جس کے ساتھ دو نشان بردار چلتے تھے۔ بابا صاحب کی سواری کے ساتھ ان کے "کوتل" میں سے جناب محمد حسین بابا صاحب، خواجہ علی امیرالدین صاحب اور جناب غوث قادر محی الدین صاحب کی سواریاں ہوتی تھیں۔ بابا صاحب کی بگھی کے اطراف عقیدت مندوں اور ان سے روحانی تعلق رکھنے والے حضرات کا ہجوم ہوتا تھا۔ یہ جلوس میدانِ کربلا گھوم کر واپس ہو جاتا تھا۔

دس محرم الحرام ۱۳۴۲ھ کو روایت کے مطابق بابا صاحب جلوس کے ساتھ میدانِ کربلا کی طرف چلے۔ شکردرہ سے نکل کر کچھ دُور پہنچے تو آپ نے وزیر نامی نشان بردار کے ہاتھ سے نشان لے کر خود اٹھا لیا! اور یہ اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو گئے

امامِ دیں سلطانِ مدینہ شاہوں کے سردار حسینؓ

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت بابا صاحب کی عجب شان تھی۔ آپ کے اندر حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت حسینؓ کا عکس نظر آ رہا تھا۔ بابا صاحب کی نسبتِ حسینی کو دیکھ کر لوگ بے اختیار قدم بوسی کر رہے تھے۔ ہزاروں افراد کا مجمع ساتھ تھا۔ اور لوگ دیکھ رہے تھے کہ بابا صاحب کا دریائے عطا جوش میں ہے، جو جاتا ہے اُسے عطا کا مژدہ سناتے ہیں۔

محرم کی ۱۶ تاریخ کو بابا صاحب قدرے بخار میں مبتلا ہوئے۔ مہاراجہ رگھوجی

اور دیگر جاں نثار متفکر ہو گئے کیوں کہ ادھر دو ماہ سے بابا صاحب نے کچھ تشویشناک اشارے دینے شروع کر دیئے تھے۔ مہاراجہ نے کئی ڈاکٹر بابا صاحب کی خدمت میں مقرر کر دیئے اور بابا صاحب کے عقیدتمند حکیم ظفر حسین صاحب بھی ہمہ وقت بابا صاحب کے پاس موجود رہنے لگے۔ بابا صاحب کے معتقد ڈاکٹر چولکر صاحب بھی آئے۔ انھوں نے بابا صاحب کو دیکھا اور کہا کہ مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس کا علاج کیا جائے تمام کوششوں کے باوجود بابا صاحب کی طبیعت روز بروز گرتی گئی۔

بابا صاحب کی طبیعت کا رجحان اور طرز عمل دیکھ کر مہاراجہ رگھوجی نے ارادہ کیا کہ تمام لوگوں کو بابا صاحب سے ملنے کے لئے بلالیں۔ بابا صاحب نے بھی مہاراجہ کو حکم دیا کہ عام اعلان کر دیا جائے کہ ہر شخص ملاقات کے لئے آسکتا ہے

۲۶۔ محرم کا سورج طلوع ہوا۔ آج جاں نثاروں اور خادموں کو بابا صاحب کے انداز و اطوار بدلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اور یہ تبدیلی ان کے لئے اضطراب کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ اسی اضطراب و تشویش کے عالم میں دن ڈھل گیا اور مغرب کا وقت قریب آگیا۔ بابا صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چاروں طرف لوگ موجود تھے سب کی بے چین اور بے قرار نظریں بابا صاحب کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک بابا صاحب پلنگ سے اُٹھے اور حاضرین پر مشفقانہ نظر ڈالی۔ پریشان اور دل گرفتہ جاں نثاروں کو تسلی آمیز کلمات سے مخاطب کیا اور ہاتھ اٹھا کر سب کے لئے دعا کی۔ آپ کا انداز تخاطب بدلا ہوا تھا۔

دعا اور کلمات تسلی و تشفی کے بعد بابا صاحب پلنگ پر لیٹ گئے اور ایک بلند و گہری سانس کے ساتھ ہی آپ کی رُوح پر فتوح نے جسم خاکی سے رشتہ

منقطع کر لیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یوم وصال پیر تھا۔ تاریخ ۲۶۔ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۷۔ اگست ۱۹۲۵ء تھی۔

یہ حادثہ حاضرین کے دل پر بجلی بن کے گرا۔ ان کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ آنکھیں بے اختیار آنسو برسانے لگیں۔ باپ سے زیادہ مشفق اور ماں سے زیادہ مہربان ہستی کی جدائی ان کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔

بابا صاحب کے وصال کی خبر محل سے نکل کر شکر درہ میں پہنچی اور جنگل کی آگ کی طرح سی پی اور بیرار میں پھیل گئی۔ پورا ناگ پور ماتم کدہ بن گیا۔ ہر مذہب اور ملت کے لوگ جوق در جوق اپنے بابا کے آخری دیدار کے لئے آنے لگے۔ چوبیس گھنٹے تک لوگ زیارت کرتے رہے لیکن پھر بھی لوگوں کا ہجوم کم نہ ہوا۔ لوگ پروانہ وار جنازے کا طواف کر رہے تھے اور یوں رو رہے تھے جیسے ان کے ماتھوں پر یتیمی کا داغ لگ گیا ہو۔

مدفن کے لئے وہی مقام منتخب کیا گیا جس کی مٹی زمانۂ حیات میں بابا صاحب نے سونگھی تھی۔ جنازۂ مبارک کو تمام شہر میں گھمایا گیا۔ مہاراجہ کے محل سے سرس پیٹھ، اجبعہ دروازہ، گانجہ کھیت، اتوارا ہوتا ہوا جنازہ تاج آباد لایا گیا۔ تقریباً تیس ہزار افراد پروانہ وار جنازے کے ساتھ تھے۔ نمازِ جنازہ مولوی محمد علی صاحب نے پڑھائی جو امراؤتی میں مدرس تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے بابا صاحب کو جنازے کے باہر کھڑے دیکھا۔

ہندوستان کے اخبارات نے بابا صاحب کے وصال کی خبر کو جلی حرفوں سے

شائع کیا اور تبصرے لکھے۔

بجنور کے اخبار "مدینہ" نے ۱۳۔ دسمبر ۱۹۲۵ء کو حضور بابا صاحبؒ کی وفات پر اس طرح اظہار خیال کیا۔

"حضورؒ کی زندگی میں لوگ دور دور سے آپ کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ جو شخص حاجت مند آتا، حضورؒ حق تعالیٰ سے اس کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کی دعا فرماتے۔ کثرت سے عقیدت مند اور مریض، کوڑھی، اپاہج، آسیب زدہ اور دیگر قسم کے حاجت مند آپ کی امداد کے خواہاں دربار میں پڑے رہتے تھے۔ ہر آدمی آپ کے وجود سے فیض باطنی و ظاہری حاصل کرتا۔ ہر وقت لنگر خانہ جاری رہتا تھا۔ صدہا غریب و مسکین، یتیم و لیسر کی پرورش کا سامان دربار میں موجود تھا۔"

آندھرا پتریکا نے ۲۲۔ اگست ۱۹۲۵ء کو لکھا۔

"رام ایک جنم میں آکر چلا گیا اور اب تاج الدین بابا کے جنم میں آیا تھا جو ۱۔ اگست ۱۹۲۵ء کو اس دنیا سے چلا گیا۔ اور دنیا نے افسوس کہ پہچانا نہیں۔"

حضرت بابا صاحبؒ ایک صاحبِ اختیار ولی ہیں۔ ان کی کرامات اور فیوض و برکات ان کے پردہ فرمانے کے بعد بھی جاری و ساری ہیں۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیا اپنی ایک اشاعت میں رقم طراز ہے:

ناگ پور سے ایک عجیب واقعے کی خبر آئی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص جو کچھ عرصہ قبل موٹر کے حادثے میں لنگڑا ہو گیا تھا اور ناگ پور ریلوے اسٹیشن کے قریب بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرتا تھا، وہ صرف ایک رات میں صحت یاب ہو گیا۔ اس شخص نے ہمارے نامہ نگار کو بتایا کہ اس نے گزشتہ ماہ ناگ پور کے ایک مسلمان بزرگ کے مزار پر

حاضری دی اور اپنی صحت یابی کے لئے دُعائیں مانگیں۔ لیکن کئی ہفتے کی مدّت گزر جانے کے بعد بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس شخص نے بد دلی اور مایوسی کے ساتھ حضرت بابا صاحبؒ پر شدت سے طعن طعن کیا۔ رات کو اس شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضرت بابا صاحبؒ سفید عمامہ پہنے ہوئے تشریف لائے اور اس لنگڑے کو حکم دیا کہ سیدھا کھڑا ہو جائے۔ کئی مرتبہ کہنے کے بعد بھی وہ کھڑا نہ ہوا تو حضرت نے اُسے کچھ مٹھائی کھلائی اور شربت پلایا۔ پھر ایک ٹھوکر مار کر حکم دیا کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ لنگڑا آن کی آن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے نامہ نگار کا بیان ہے کہ ناگ پور میں متعدد اشخاص موجود ہیں جو اس واقعے کی تصدیق کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ شخص مذکور اپنے لنگ کی وجہ سے اس ہفتے تک زمین پر رینگتا پھرتا تھا۔

ہر سال بابا تاج الدینؒ کا عرس ۲۶۔ محرم سے شروع ہو کر ۲۹۔ محرم تک جاری رہتا ہے۔ ناگ پور کے علاوہ بہت سے دوسرے مقامات پر بھی آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔ ناگ پور میں آج بھی صندل شریف ان ہی راستوں سے گزار کر تاج آباد لایا جاتا ہے جن سے بابا صاحب کا جنازہ لے جایا گیا تھا۔ عرس میں ہزارہا عقیدت مند اور زائرین بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے ہیں۔

تاج آباد جانے سے پہلے زائرین شکر درہ حاضر ہوتے ہیں جہاں بابا صاحب کی چلّہ گاہ مشہور ہے۔ شکر درہ میں حاضری کی وجہ بابا صاحب کا وہاں سے گہرا تعلق اور ان کا مہاراجہ رگھو جی راؤ سے یہ فرمان ہے کہ میرا بستر تیرے گھر سے لاکھوں برس نہیں اٹھ سکتا۔

۲۶۔ محرم کی شام شکر درہ میں بھی عرس منایا جاتا ہے۔ یہاں سے صندل شریف
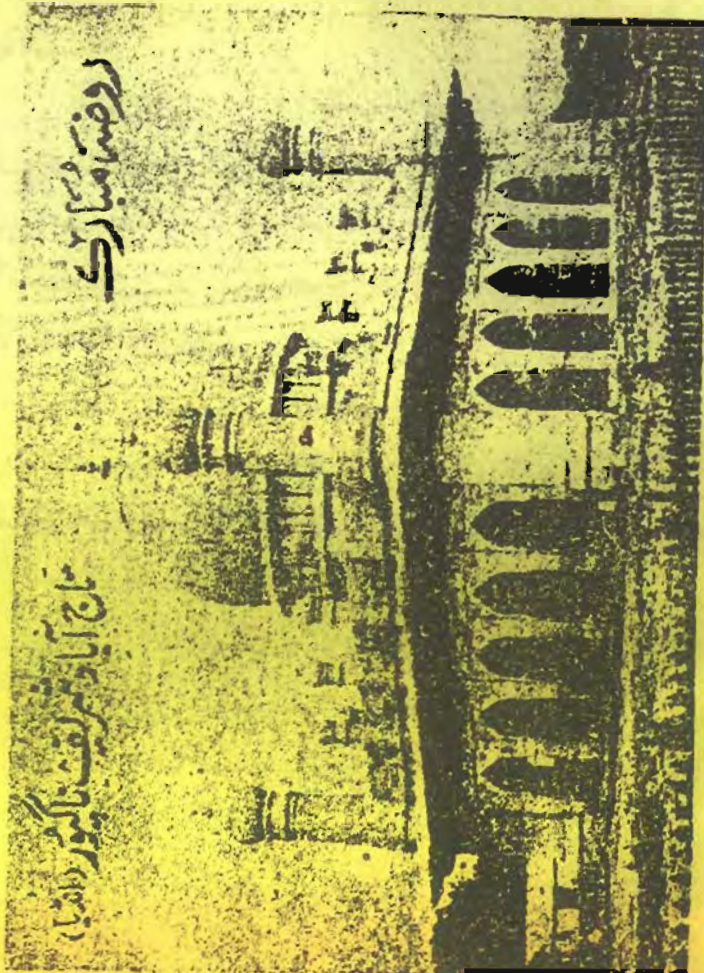
نکل کر راجہ صاحب کے محل میں جاتا ہے اور پھر واپس شکردرہ کی چلہ گاہ میں لے جایا جاتا ہے۔

قاضی امین الدین جو مہاراجہ رگھوجی کے ہاں ملازمت کرتے تھے، بیان کرتے ہیں کہ بابا صاحب کے وصال کے دسویں روز تاج آباد گیا اور مزار سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بابا صاحب سے کہا: "آپ شکردرہ سے تاج آباد آ گئے۔ اس لئے بہت سے لوگ یہاں آ کر رہنے لگے ہیں۔ میں آپ کے حکم سے مہاراجہ کے ہاں ملازم ہوا تھا، اگر اجازت دیں تو میں بھی تاج آباد آ جاؤں۔"

ابھی میں عرض پیش کر رہا تھا کہ حضرت اللہ کریم (بابا صاحب کے فیض یافتہ) میرے پاس آئے اور فرمایا: "تجھے بنگلے میں رہ کر راجہ کو سلام کرنے کا حکم ہے۔ لال بنگلے سے ابھی اللہ کا پیارا اٹھا نہیں ہے۔"

(لال بنگلے سے مراد شکردرہ کا وہ محل ہے جہاں بابا صاحب کا قیام تھا)۔

فیض اور فیض یافتگان

بابا تاج الدین ناگپوریؒ علوم و فیوض کا ایسا سمندر ہیں جس سے ہزاروں لاکھوں افراد اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوئے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، پارسی، عیسائی، سکھ سب دربار تاج الاولیاءؒ میں حاضر ہوتے اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے فیض و نعمت کے موتی چنتے۔ سالکین، متلاشیانِ حق اور طالبین سب کی دلی مراد بابا صاحبؒ کی ایک نظر میں بر آئی۔ بابا صاحبؒ کا ارشاد ہے، "میں سوا لاکھ ولی بناؤں گا۔" فیض کی یہ تقسیم اس وقت بھی جاری تھی جب آپ اس مادی دنیا میں جلوہ افروز تھے اور اب بھی جاری ہے جب آپ پس پردہ موجود ہیں۔ بابا صاحبؒ کا یہ بھی فرمان ہے کہ آج تک کسی سے پانچ پیسے نہیں بنے، میں پانچ پیسے بناؤں گا۔ میرا نام تاج الدین ہے۔

بابا تاج الدینؒ کے ہاں مروجہ طرز میں بیعت و ارشاد کا طریقہ رائج نہ تھا۔ لوگ حاضر ہوتے اور بابا صاحب جس کے لئے جو ضروری سمجھتے اس کو تلقین کر دیتے۔ کسی کو کم کھانے کا حکم ہوتا تو کسی سے کہا جاتا کہ خوب کھاؤ۔ کسی کو خلوت نشیں کر دیتے۔ اور کسی کو جلوت میں رہنے کے لئے ارشاد فرماتے۔ بابا صاحبؒ کی روحانی توجہ اور نگہداشت میں جو مادرانہ و پدرانہ شفقت و محبت کا عنصر موجود تھا اس کے پیش نظر بابا صاحبؒ کے

فیض یافتگان کو باباصاحبؒ کے بچے کہا جاتا تھا۔

باباصاحبؒ کے فیض یافتگان کا تذکرہ بالواسطہ باباصاحب کا تذکرہ ہے۔ ان تذکروں میں باباصاحب موجود ہیں۔ ان کا مخصوص طرزِ تخاطب، طریقۂ تعلیم اور تصرّف موجود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق باباصاحب نے کچھ ایسے فقرے ارشاد فرمائے جن سے ان کی روحانی قدر ومنزلت کا اظہار یا باباصاحبؒ سے ان کے روحانی تعلق کا اشارہ ملتا ہے۔ فیض یافتگان کی فہرست میں ان درویشوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو باباصاحبؒ کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ کتنے ہی باسعادت ایسے بھی ہیں جو عوام کے سامنے نہیں آئے اور خاموشی سے اپنا کام کرکے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

قلندر بابا اولیاءؒ کے ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ بابا تاج الدینؒ کے زمانۂ حیات میں دو ہستیاں ایسی تھیں جنہیں باباصاحبؒ سے خصوصی روحانی نسبت حاصل ہوئی — ایک حضرت انسان علی شاہؒ اور دوسری مریم بی اماںؒ۔

حضرتِ انسان علی شاہ

حضرت انسان علی شاہؒ بابا تاج الدینؒ کے فیض یافتگان میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے اور آپ کے سوچنے کی طرز بھی باباصاحبؒ سے ملتی تھی۔

انسان علی شاہ کی عمر ایک ماہ تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد آپ کی کفالت نانا اور نانی نے کی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے ایک رشتہ دار سے حاصل کی جو نہایت عالم وفاضل تھے۔ انسان علی شاہ کی طبیعت میں بچپن ہی سے عبادت اور ریاضت کا ذوق وشوق موجود تھا۔

انسان علی شاہ ایک صاحبِ حیثیت شخص تھے۔ آپ کئی گاؤں کے مال گزار تھے۔ لباس نہایت نفیس اور قیمتی پہنتے اور اعلیٰ نسل کا گھوڑا سواری میں رہتا تھا۔ متمول اور بلند حیثیت ہونے کے باوجود نہایت بااخلاق ومنکسر المزاج تھے۔ آپ نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوائی تھی اور اس کی امامت بھی خود کرتے تھے۔ مہمانوں اور مسافروں کی خاطر تواضع کرکے آپ کو بہت خوشی ہوتی تھی۔

ابھی انسان علی شاہ ۲۲ برس کے تھے کہ آپ کی طبیعت میں تیزی سے تغیر رونما ہوا اور جذب واستغراق غالب ہوگیا۔ عالمِ جذب میں آپ لوگوں کو مارنے دوڑتے۔ دماغی مریض سمجھ کر ان کا علاج کرایا گیا اور جب حالت نہیں سنبھلی تو طے پایا کہ ان کو بزرگوں کے مزارات پر لے جایا جائے، ________ ۔ چار چھ آدمی انسان علی شاہ کو لے کر ہندوستان کی مشہور درگاہوں پر گئے۔ آپ جس مزار پر جاتے، اندر داخل ہوتے ہی باہوش اور مؤدب ہوجاتے۔ فاتحہ پڑھ کر مزار سے باہر آتے ہی آپ کا ہوش

جذب میں تبدیل ہو جاتا۔ تمام مزاروں پر حاضر ہو کر جب انسان علی شاہ اپنے گاؤں لوٹ آئے لائے گئے تو لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس زمانے میں بابا تاج الدین کا شہرہ ہر طرف پھیل رہا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو بابا صاحب کا دربار ہی باقی بچا ہے، وہاں بھی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لوگ انسان علی شاہ کو لے کر شکردرہ پہنچے۔ انسان علی شاہ کو جب بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو بابا صاحب نے فرمایا۔

"ارے! یہ تو بڑے صاحب ہیں۔ روشن چراغ ہیں۔ میرے بعد یہی پل کے بادشاہ ہوں گے۔ ان کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں توڑ دو۔ اب ان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

حسب حکم بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کھول دی گئیں لیکن اب انسان علی شاہ پر جذب و بیخودی کے بجائے سکون اور ہوش کا غلبہ تھا۔ کچھ عرصہ بابا تاج الدین کی خدمت میں رہنے کے بعد انسان علی شاہ اپنے وطن چلے گئے اور آپ سے کرامات ظاہر ہونے لگیں۔ انسان علی شاہ کے اندر بابا تاج الدین کی جھلک نمایاں تھی۔ انداز و اطوار میں بھی بابا صاحب سے مشابہت رکھتے تھے۔

قلندر بابا اولیاءؒ سے روایت ہے کہ جب انسان علی شاہ سے بابا تاج الدینؒ نے فرمایا کہ اگر تم ناگ پور سے مدراس تک بھیک مانگتے جاؤ اور واپس آؤ تو میں تمہیں بیعت کر لوں گا۔ انسان علی شاہ جیسے صاحبِ ثروت اور ذی جاہ شخص نے بابا صاحب کے حکم پر پورا پورا عمل کیا اور بابا صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ بابا تاج الدینؒ نے آپ کو "انسان" کا نام دیا۔

مریم بی اماں

مریم بی اماں کی پیدائش ہندوستان کے قصبہ کا جلیشور تعلقہ مرتضیٰ پور ضلع اکولہ میں ہوئی۔ ان کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ والد کا نام عزیز الدین اور والدہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ مریم بی نے قدرے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور بس۔ لیکن ذوقِ عبادت و ریاضت [illegible] تھا۔ ان کا اکثر وقت غور و فکر اور خلوت نشینی میں گزرتا تھا۔ شادی کے بعد گھریلو مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود ان معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مریم بی کا خاندان ایک فقیر دوست خاندان تھا۔ درویشوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضری دینا، ان کی خدمت کرنا اس خاندان کے لوگوں کا شیوہ تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مریم بی کے بھائی غلام محی الدین صاحب کامٹی میں ملازمت کر رہے تھے اور مریم بی بھی ان دنوں کامٹی میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جناب غلام محی الدین صاحب کو پتہ چلا کہ کامٹی میں ایک صاحبِ کمال اور روشن ضمیر بزرگ وارد ہوئے ہیں۔ ان بزرگ میں درویشی اور فقیری کے اوصاف دیکھ کر ایک دن غلام محی الدین صاحب نے بزرگ سے درخواست کی۔ "حضرت! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ہمارے گھر میں چند دنوں مہمان رہ کر غریب خانہ کو رونق بخشیں اور ہمیں اپنی خدمت کا موقع فراہم کریں۔ ہم اسے اپنی خوش بختی تصور کریں گے۔"

بزرگ نے درخواست قبول کر لی۔ ایک دن جب گھر کے سب لوگ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے مریم بی کی والدہ یعنی عائشہ بی بی سے مخاطب ہو کر کہا: "بی بی! اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو لعل عطا کئے ہیں۔ اور یہ ان میں سے ایک ہے۔" بزرگ

کا اشارہ مریم بی کی طرف تھا۔

ان بزرگ نے مریم بی کو مخاطب کیا۔ "بیٹی! آفتابِ ولایت ناگپور کے افق سے ضیا پاشی کر رہا ہے۔ جاؤ اور اپنے جسم اور رُوح کو اس سے منوّر کر لو۔ ناگپور کا پاگل خانہ اس وقت شہنشاہِ ہفت اقلیم بابا تاج الدین کا پایہ تخت ہے۔ ان کی خدمت میں جاؤ! مشیّت نے تمہاری قسمت میں حضور بابا صاحب کا فیض لکھا ہے۔"

مریم بی فوراً ناگپور کے پاگل خانے میں حاضر ہوئیں جہاں ان دنوں بابا تاج الدینؒ رہتے تھے۔ مریم بی جیسے ہی وہاں پہنچیں، بابا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے قریب آ کر کہا: "ہم تو ایک عرصہ سے تیرا انتظار کر رہے تھے۔"

یہ کہہ کر بابا صاحب نے مریم بی کے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور کہا۔ "روزانہ آیا کر!"

محترمہ مریم بی نے حضرت بابا صاحب کی ہدایت پر اس طرح عمل کیا کہ روزانہ پاگل خانے آتیں اور پھاٹک کے باہر ایک مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر بابا صاحب کی طرف متوجہ رہتیں۔ رفتہ رفتہ اس شغل میں اتنی محویت اور استغراق پیدا ہوا کہ کھانے پینے اور کپڑوں کا ہوش تک جانے لگا۔

ایک سال گزر گیا۔ اس دوران بابا تاج الدینؒ پاگل خانے سے شکردرہ اور پھر واکی تشریف لے گئے۔ مریم بی بھی واکی تشریف لے گئیں اور قصبہ پاٹن ساونگی میں قیام کیا۔ یہاں بھی وہ ہر روز حضور بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتیں جو اُن پر نہایت شفقت و محبت کی نظر رکھتے تھے۔ یہ زمانہ بھی تقریباً ایک سال پر محیط ہے۔

ایک روز بابا تاج الدینؒ مریم بی کو لے کر کنہان ندی کے اطراف میں پہنچے اور ایک

ویران اور بے آباد جگہ جو جنگلی جانوروں کی گزرگاہ تھی، وہاں پہنچ کر رُک گئے اور مریم بی کو حکم دیا: "یہاں بیٹھ جا اور بلا اجازت نہ اٹھنا۔"

یہ سننا تھا کہ دل میں کسی قسم کی جھجک، خوف یا ڈر لائے بغیر مریم صاحبہ وہاں بیٹھ گئیں اور سامانِ خورد و نوش تک کے متعلق نہ سوچا۔ مریم صاحبہ کو وہاں چھوڑ کر بابا تاج الدینؒ واپس چلے آئے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ بابا صاحبؒ کے خدام اور عقیدت مند اس دوران سخت حیران و پریشان رہے کیوں کہ بابا صاحبؒ نے ایک ہفتہ مطلق نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ایک ہفتے بعد بابا صاحبؒ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔ "چمن داکوڑیا! چمن داکوڑیا!"

مجمع میں سے ایک شخص فوراً ہاتھ باندھے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حضور بابا صاحبؒ نے اس سے فرمایا: "اماں مریم صاحبہ تیرے کھیت کی طرف کے جنگل میں موجود ہیں۔ تو جا اور انہیں کھانا کھلا اور خدمت کیا کر۔"

داکوڑیا نے فوراً کھانا تیار کروایا اور ساتھ لے کر اماں مریم صاحبہ کی تلاش میں نکلا۔ کافی دیر تلاش کے بعد اس نے جھاڑیوں کے جھنڈ میں اماں صاحبہ کو چادر اوڑھے لیٹے پایا۔ اس نے کئی آوازیں دیں لیکن اماں مریم صاحبہ کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی اور وہ بدستور آنکھیں بند کئے چادر اوڑھے لیٹی رہیں۔

آخر میں داکوڑیا نے کہا: "میں بابا صاحب کے حکم پر آپ کے لئے کھانا لایا ہوں۔" مریم اماں صاحبہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں، نہایت تعظیم سے کھانا لیا اور بڑی مشکل سے تھوڑا سا کھایا۔

مریم بی امّاں صاحبہؒ کا مٹی سے (ناگپور)

لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت واکوڑیا کھانا لے کر امّاں صاحبہ کی تلاش میں گیا ہے اس کے کافی دیر بعد باباصاحب نے کھانا منگوایا اور ایک ہفتے کے بعد پہلا لقمہ منہ میں ڈالا۔

مریم امّاں صاحبہ فرماتی تھیں کہ میری برسوں کی ریاضت کو حضور نے ازراہِ عنایت و شفقت دنوں میں طے کرایا کیوں کہ میں عورت ذات اور دُبلی پتلی تھی، اس لئے حضور نے میرے حال پر خاص رحمت کی نظر رکھی۔ اور جلد ہی مجھ پہ باب ولایت کھول دیا اور اپنی قربت میں رہنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

مریم امّاں صاحبہ کے لئے ایک جگہ مقرر کر دی گئی اور واکی شریف میں ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو گیا۔ تاج الاولیار بابا تاج الدینؒ کے فیض کی تقسیم اب مریم امّاں صاحبہ کے ذریعے بھی ہونے لگی۔ باباصاحبؒ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو امّاں صاحبہ کے پاس جانے کا حکم دیتے اور لوگ ان کے دربار سے بامراد لوٹتے۔ حاضرین نے یہ بات محسوس کی کہ جو بات حضرت بابا تاج الدینؒ اپنی نشست گاہ پر فرماتے، اس بات کا اظہار امّاں صاحبہ اپنی قیام گاہ پر کر دیتی تھیں۔

بابا تاج الدینؒ مریم امّاں صاحبہ پر جو نظرِ عنایت رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ باباصاحب نے تنبیہ کر دی تھی کہ ان کے پاس حاضری دینے سے پہلے امّاں صاحبہ کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ لوگوں نے اکثر دیکھا کہ درویش اور فقرا جو دربارِ تاج الاولیار میں باباصاحبؒ کے دیدار کے لئے حاضر ہوئے اُن سے باباصاحبؒ اس وقت تک نہ ملے جب تک کہ انہوں نے مریم امّاں صاحبہ کے ہاں حاضری نہ دی۔ لوگوں نے یہ بات بھی مشاہدہ کی کہ باباصاحبؒ مریم اماں صاحبہ کی کسی بات کو رَد نہیں فرماتے تھے۔ باباصاحبؒ امّاں صاحبہ کو احتراماً اپنی والدہ کے نام پر مریم بی

کہہ کر پکارتے تھے اور فرمایا کہ وہ تو میری ماں ہے۔ زمانۂ ریاضت میں بابا صاحبؒ نے امّاں صاحبہ کا نام بھائی عبدالرحیم رکھا تھا اور بعد میں گاہے بہ گاہے اسی نام سے آواز دیتے تھے۔

جب بابا تاج الدینؒ واکی سے شکر درہ منتقل ہوئے تو مریم امّاں صاحبہ بھی شکر درہ تشریف لے گئیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس زمانے میں آپ کو جسمِ خاکی ایک بوجھ معلوم ہونے لگا۔ ابھی شکر درہ میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ آپ نے پیرہنِ خاکی اُتار پھینکا اور اس مادّی دنیا سے پردہ فرمالیا۔ یہ مورخہ ۲۷ شوال ۱۳۳۷ھ کا دن تھا۔ بابا تاج الدینؒ کے حکم پر آپ کا جنازہ شکر درہ سے کامٹی لایا گیا اور گاڑھا گھاٹ پر آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بابا قادرؒ اولیاء

بابا قادر کا تعلق ترچنا پلی کے نواب خاندان سے تھا جس میں بعض درویش بھی گزرے ہیں۔ نواب محمد علی آپ کے والد تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں ترچنا پلی کے مقام پر بابا قادر کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کئے گئے لیکن تعلیم میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ البتہ اولیاء اللہ اور پیغمبروں کے قصے بہت غور سے سنتے تھے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ کی تنہائی پسندی اور محویت میں اضافہ ہوتا گیا۔ نوجوانی میں جان حسین کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ ان ہی دنوں بابا قادر کے والد کا آخری وقت آپہنچا۔ والد نے بابا قادر کو پاس بٹھا کر کہا: "بیٹے! تمہارے خاندان میں فقیرانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ میرے نصیب میں تو نہیں تھا لیکن تم بابا تاج الدین اولیاءؒ کے حضور ناگپور ضرور حاضر ہونا۔"

والد کی وصیت کے مطابق شکر درہ بابا تاج الدینؒ کے پاس پہنچے۔ بابا صاحبؒ نے دیکھتے ہی کہا: "شیر کا بچہ شیر ہے۔"

یہ کہہ کر پاس رکھے ہوئے چند کیلوں میں سے ایک کیلا اٹھا کر بابا قادر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کیلا ذرا گلا ہوا تھا۔ نفاست پسند ہونے کی وجہ سے بابا قادر کی طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ کیلا کھائیں۔ انہوں نے آہستہ سے ہاتھ پشت کی طرف کر لیا۔

بابا تاج الدین نے فرمایا: "کھاؤ یا نہ کھاؤ، تمہیں جو کچھ پہنچنا تھا، پہنچ گیا۔"

بابا تاج الدین کے لئے کھانا اور چائے محمد غوث بابا کی جھونپڑی سے جاتا تھا۔ لنگر خانے کے مہتمم حیات خاں تھے جو بابا صاحب کو کھانا اور چائے پہنچاتے تھے۔ ان کو اپنی اس خدمت گزاری پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے ایک دن بابا قادر کو کلہاڑی دیتے ہوئے کہا: "صاحب زادے! یہاں مفت کا کھانا نہیں ملتا۔ کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم لنگر خانے کے لئے لکڑیاں پھاڑا کرو۔"

بابا قادر کلہاڑی لے کر لکڑیاں پھاڑنے لگے۔ بڑے ناز و نعم میں پلے تھے اور کبھی ایسا سخت کام نہیں کیا تھا۔ بمشکل آدھ گھنٹہ کام کیا ہوگا کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ چنانچہ کلہاڑی رکھ کر لیٹ گئے۔

ادھر حیات خاں کھانا لے کر بابا تاج الدین کے پاس پہنچے تو بابا صاحبؒ نے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دکھاتے ہوئے کہا: "دیکھو جی! یہ حیات خاں ہم سے لکڑیاں پھڑواتا ہے۔ یہ دیکھو، ہمارے ہاتھ کے چھالے۔"

لوگوں نے دیکھا کہ بابا تاج الدینؒ کے ہاتھوں پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔

بابا تاج الدین اولیاءؒ اشاروں میں گفتگو فرماتے تھے۔ عالمِ جذب و کیف میں

بولتے تو اہلِ نظر ہی ان اشاروں کنایوں کو سمجھتے جو گفتگو میں پوشیدہ ہوتے تھے۔ بابا قادر کو دربارِ تاج الاولیاء میں رہتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اس عرصے میں آپ بابا صاحب کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے لگے تھے۔

ایک مارواڑی سیٹھ اور اس کی بیوی اپنے اکلوتے بچے کو لے کر بابا تاج الدینؒ کے پاس آئے۔ بچہ دن رات روتا رہتا تھا۔ اور ہر طرح کا علاج بے سود ثابت ہوا تھا۔ بابا صاحبؒ کے سامنے بچہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "چولہے میں ڈال دے۔"

میاں بیوی اس عجیب و غریب جملے سے مایوس اور مغموم واپس ہوئے۔ راستے میں بابا قادر ملے۔ انہیں جب ۔۔۔ بتایا گیا تو ہنس کر کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو نظر لگ گئی ہے۔ کچھ مرچیں وار کر چولہے میں ڈال دو۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بچے کو آرام آگیا۔

بابا تاج الدین کی خدمت میں چند سال رہنے کے بعد بابا قادر وجے نگرم لوٹ آئے لیکن اب ان کی حالت بدل چکی تھی۔ اب آپ ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ بہت کم بولتے تھے۔ زیادہ وقت اکڑوں بیٹھ کر سر گھٹنوں میں دبائے رکھتے تھے۔ یہی اندازِ نشست بابا تاج الدینؒ کا تھا۔ غذا بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ پھر بابا قادر نے وجیانگرم کے باہر جنگل میں ڈیرا ڈال لیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی جہاں لوگ دن کو بھی جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ پر فقیری کا رنگ تیزی سے چڑھنا شروع ہوا۔ جو کہہ دیتے پورا ہو جاتا۔

پہلے پہل تو بابا قادر جنگل میں کھلی چٹان پر بیٹھا کرتے تھے لیکن بعد میں دوستوں نے پتھر میں سوراخ کر کے تاڑ پان کی ایک چھتری نصب کر دی۔ ۱۹۲۵ء میں چٹان پر چار

کھمبوں کے اوپر گنبد نما چھت ڈال کر پتھروں کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ ۱۹۳۱ء سے بابا صاحب نے اس حجرے میں مستقل رہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ حجرے کے آس پاس دوسری تعمیرات نمودار ہونے لگیں۔ حجرے کے ساتھ ایک محفل خانہ تعمیر کر دیا گیا۔ لوگوں نے چاہا کہ محفل خانے کو پکا تعمیر کر دیا جائے لیکن بابا قادر نے اجازت نہ دی۔ محفل خانے کا فرش بھی ریت کا تھا۔

بابا قادر کی شخصیت نے اس ویران جگہ کو جہاں لوگ دن کے وقت جاتے ہوئے ڈرتے تھے، ایک بارونق جگہ میں بدل دیا۔ ایک چھوٹی سی بستی وہاں وجود میں آگئی۔ جس کا نام قادر نگر رکھا گیا۔

مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار لوگ قادر نگر پہنچ کر درختوں کے نیچے انتظار کرتے کہ بابا قادر آئیں اور ان کی بپتا سنیں۔ بابا قادر محفل خانے کے چبوترے کے کنارے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ بائیں طرف بنے ہوئے کٹہرے میں لوگ ایک ایک کر کے آتے۔ بابا قادر ہر ایک کے مسئلے کو نہایت توجہ، محبت اور شفقت کے ساتھ سنتے۔ ڈھارس بندھاتے، اطمینان دلاتے اور جس طرح مناسب سمجھتے مدد فرماتے۔ روزانہ یہی معمول رہتا۔ اور جب تک ایک ایک شخص کی بات نہ سن لیتے اپنی جگہ سے نہ ہلتے۔ دیکھنے والا مصروفیت دیکھ کر تھک جاتا لیکن بابا قادر کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔

بابا قادر کا پسندیدہ ترین عمل غریبوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانا تھا۔ آپ کھانا کھلا کر بے حد خوش ہوتے تھے اور آپ کے چہرے پر اطمینان دوڑ جاتا تھا۔ عقیدتمند اور متمول حضرات کسی مستقل ذریعے سے پیسہ دینا چاہتے تو بابا قادر کہتے "جو آج کا اللہ ہے وہی کل کا بھی اللہ ہے۔ اگر تم خرچ کرنا چاہتے ہو تو غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ان کی امداد کرو۔" جو

لوگ آپ سے تعلق رکھتے تھے ان سے فرماتے "رزقِ حلال کے لئے سعی اور کوشش کرو، لیکن توکل کو ہاتھ سے نہ چھوڑو اور امید و بیم سے ماورا ہو جاؤ۔"

سنہ ۱۹۵۹ء میں بابا قادر ناگپور گئے اور بابا تاج الدینؒ کے مزار پر حاضری دی۔ مزار پر یہ شعر پڑھا ؎

جنت کا در کھلا ہے ترے در کے سامنے

بے شک خدا کا گھر ہے ترے گھر کے سامنے

آپ نے اس جگہ کی بھی زیارت کی جہاں بابا تاج الدین بیٹھا کرتے تھے۔ اس جگہ کو بھی دیکھا جہاں بابا تاج الدین رہتے تھے اور بابا تاج الدین کے پلنگ اور چبوترے کو بوسہ دیا۔ ناگ پور سے واپسی پر آپ نے اس بات کی طرف کئی اشارے کئے کہ ان کا وقتِ رخصت قریب ہے۔ دن بدن آپ کی طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوتا گیا اور بالآخر ۲۷۔ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کو آپ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔

حضرت مولانا محمد یوسف شاہ

آپ کا اصل نام مولانا عبدالکریم تھا اور علاقہ جے پور سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک فاضل عالم تھے اور صوفی عبدالحکیم شاہ سے بیعت تھے۔ صوفی عبدالحکیم شاہ نے آپ کو حکم دیا کہ تم واکی جاکر بابا تاج الدین کی خدمت میں حاضری دو۔ مولانا عبدالکریم مرشد کے حکم کے مطابق بابا صاحب کے پاس پہنچے تو ان کی مجذوبانہ حالت دیکھ کر مایوسی پیدا ہوئی اور خیال کیا کہ جو شخص خود نیم بے ہوش دکھائی دیتا ہے وہ میری کیا تربیت کرے گا۔ نہ جانے کیوں میرے مرشد نے مجھے ایسے شخص کے پاس بھیج دیا ہے۔ مولانا ابھی اسی الجھن اور

مایوسی میں گرفتار تھے کہ بابا تاج الدین نے سر اٹھا کر آنکھیں کھولیں اور لمحہ بھر کے لئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا کے ہوش و حواس جاتے رہے اور عالمانہ لباس اتار پھینکا۔

کئی دن تک مولانا عبدالکریم پر مستی و بے خودی طاری رہی۔ ایک دن بابا صاحب نے بلا کر حکم دیا کہ کاٹھیاوار جاؤ۔ حکم ملتے ہی مولانا کاٹھیاوار پہنچے اور وہاں رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ کاٹھیاوار سے واپس بابا صاحب کی خدمت میں پہنچے تو بابا صاحب نے اپنی نعلین (جوتیاں) دیتے ہوئے کہا "لو، ان کو پھیلاؤ۔" پھر مولانا کو یو پی جانے کا اشارہ ہوا۔ یو پی میں مولانا عبدالکریم نے بابا صاحب کے سلسلے کو بہت وسعت دی اور بڑے بڑے علماء اور مقتدر افسر اور بابا صاحب کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوئے۔ ان میں نواب چھتاری، سابق صدر اعظم حیدر آباد، دکن اور نواب مسیح خاں طالب نگری بھی شامل تھے۔

آپ یکم ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۶ھ کو اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔

خواجہ علی امیر الدینؒ

آپ کی ولادت ایک بنجارے کے گھر میں ہوئی۔ جائے پیدائش مقام ہنگنا ضلع ناگ پور تھا۔ آپ پیدائشی طور پر غیر معمولی صفات کے حامل تھے۔ چھ برس کی عمر ہو گئی لیکن نہ کسی سے بات چیت کرتے اور نہ کھانے پینے کی آپ کو کوئی پروا تھی۔ والدین پریشان ہو کر آپ کو واکی شریف میں بابا تاج الدین کے پاس لائے۔ بابا صاحب نے فرمایا۔

"ان کو مت ستایا کرو۔ یہ بڑی شان والے ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ان کا نام خواجہ علی امیر الدین ہے۔"

اب لوگ آپ کو خواجہ علی امیرالدین کہنے لگے اور ہر شخص آپ کا احترام کرنے لگا۔

چند دنوں بعد خواجہ صاحب کے والدین تو گھر واپس چلے گئے لیکن خواجہ صاحب اور اُنکے دادا بابا صاحب کے پاس واکی میں ٹھہر گئے۔ ان دنوں خواجہ صاحب کا یہ حال تھا کہ اکثر راتوں کو جنگل کی طرف نکل جاتے اور صبح واپس آتے تو ایک دو سانپ گلے میں ہار کی طرح لٹک رہے ہوتے۔ سانپ کی موجودگی سے ان کے دادا اور دوسرے لوگ ڈر جاتے۔ یہ طرزِ عمل بہت دن جاری رہا۔ لیکن سانپ نے کسی کو نہیں کاٹا۔ خواجہ صاحب کے دادا ناراض ہوتے کہ اگر کسی کو سانپ نے کاٹ لیا تو کیا ہوگا؟ یہ سُنکر خواجہ صاحب سانپوں کو گلے سے اتار کر زمین پر رکھ دیتے۔ اور اشارے سے بھگا دیتے۔

جب بابا تاج الدین ندی کی طرف یا جنگل کے اندر گھومنے جاتے تو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے۔ خواجہ علی امیرُالدین کے دادا بھی خواجہ صاحب کو کندھے پر اٹھائے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ مشہور ہو گیا تھا کہ خواجہ صاحب جس شخص کے کندھے پر سوار ہو جاتے ہیں اُس کی ولی مراد ضرور پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ لوگ آپ کو بخوشی اپنے کندھے پر اٹھائے گھومتے جب بابا تاج الدین واکی سے شکردرہ گئے تو راجہ رگھو راؤ نے خواجہ صاحب کے رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ شکردرہ میں قیام کے دوران خواجہ صاحب اکثر جلال میں رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی توتلی زبان میں کچھ کہہ بھی دیتے۔

ایک دن خواجہ علی امیرالدین حالت جذب وجلال میں حضرت بابا تاجُ الدینؒ کی خدمت میں آئے اور توتلی زبان میں کہا۔

”محل تو اُلت دُوں؟“ (محل کو اُلٹ دوں)

خواجہ صاحب نے دوبارہ یہ جملہ ادا کیا۔ بابا تاج الدین اپنی جگہ سے اٹھ کر اُن کے

پاس گئے اور انگشتِ شہادت سے تین بار اُن کے مُنہ کو مارتے ہوئے کہا۔

”حضرت! یہ دُعا کا دربار ہے۔“

یہ سُن کر خواجہ صاحب سناٹے میں آ گئے اور گھبرا کر اپنی قیام گاہ کی طرف بھاگے۔ اُس دن کے بعد سے آپ کا جلال جمال میں بدل گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی خواجہ صاحب پر بابا صاحب کا اس قدر رُعب اور خوف طاری رہا کہ پوری زندگی بابا صاحب کے قریب نہیں گئے۔ دُور ہی سے سلام و نیاز پیش کرتے تھے۔

خواجہ علی امیرالدین کی شخصیت بابا صاحب کے فیض یافتگان میں ایک منفرد مقام کی حامل سمجھی جاتی تھی۔ آپ ایک جلیل القدر ولی اللہ تھے اور بہت سی کرامتیں آپ سے منسوب ہیں۔ آپ کے وصال کا حال بمبئی والے بابا کے تذکرے میں آئے گا۔

حضرت قادر محی الدینؒ

آپ کی عُرفیت بمبئی والے بابا تھی اور بابا تاج الدین آپ کو مستان بابا کہتے تھے۔ بمبئی والے بابا شکردرہ میں بابا تاج الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ خواجہ علی امیرالدین کے ہم صفت تھے اور توتلی زبان میں بات کرتے تھے۔ عالم جذب میں اپنے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ بابا تاج الدین نے کئی بار اپنا کُرتا اتار کر عطا کیا۔ آپ اس کو پہن لیتے لیکن یکایک جوش میں آ کر پھاڑ دیتے۔ مستان بابا، بابا صاحب سے دُور دُور رہتے تھے۔ لیکن ان کی مجذوبانہ حالت دیکھ کر بابا تاج الدین کے حضور ان کو لے جایا گیا۔ بابا صاحب آرام فرما رہے تھے۔ اٹھ بیٹھے اور کہا۔

”حضرت دھوپ میں نہیں رہتے، ہم بھی چھاؤں میں رہتے ہیں، تم بھی چھاؤں میں آ

کرو۔" یہ کہہ کر بابا صاحب نے اپنا جبہ ان کو عطا کرتے ہوئے کہا: "جبہ پہنا کرو۔" اس دن سے آپ نے جبّہ پھاڑا نہیں۔

ایک دفعہ حضرت قادر محی الدین بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا صاحب نے انہیں آتے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

"دیکھو حضرت! یہ مست آرہے ہیں۔ تم لوگوں نے سرمست کا نام سنا ہے نا۔ ان کا نام قادر محی الدین ہے۔ یہ مست ہیں۔ ان سے ڈرا کرو کہ ہم ڈرتے ہیں۔ یہ کالے ناگ ہیں۔ دیکھو ان کے سر کو۔"

لوگوں نے دیکھا کہ جب ان کے سر کے بال صاف کئے جاتے تو ایک سانپ جیسا نشان نظر آتا جس میں سانپ کا پھن پیشانی کی طرف ہوتا۔ آپ کی پیشانی پر چاند کا نشان تھا جس میں سانپ کا پھن رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آپ اس قدر پرکشش اور وجیہ تھے کہ لوگ آپ کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔

آخری زمانے میں مستان بابا صاحب پر ہمہ وقت استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جب کبھی ہوش میں آتے تو اشاروں سے اس بات کو ظاہر کرتے کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔ وصال سے چھ ماہ پہلے سے جو قوال آپ کے پاس آتا، آپ اس سے کہتے، "گاؤ ہے یاں گیو بڑی لمبی سفر۔" کبھی خوش ہو کر آپ بھی گانے لگتے۔ وصال سے چند دن پہلے جسم پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر معائنہ کرتا لیکن کوئی مرض سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد آنکھیں کھول کر کہتے۔ "لاؤ میری دوا۔" وصال سے ایک روز پہلے کہا۔ "ہم کو نہلاؤ، دھلاؤ اور دولہا بناؤ۔" چنانچہ آپ کو غسل دے کر نئے کپڑے پہنا دیئے گئے۔ پھر آپ نے ربی طلب کی اور ایک سرا حضرت فرید الدین کو

دیتے ہوئے کہا: "دور جا۔" جہاں تک رسّی جا سکتی تھی لے جائی گئی۔ مستان بابا نے کہا: "ڈیٹھو (دیکھو)! یہ میری درگاہ ہے۔" وصال کے دن بار بار کہتے: "چار بج گیا، ہماری دوا لاؤ۔"

آپ کی یہ حالت دیکھ کر لوگ ملاقات اور سلام کے لئے حاضر ہونے لگے۔ آپ ہر ایک کو دعا دیتے اور کہتے۔ "چار بجے آؤ۔" جمعے کا دن تھا۔ جیسے جیسے چار بجے کا وقت قریب آ رہا تھا، آپ کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ بار بار کہتے "ہماری دوا لاؤ، ہماری دوا لاؤ۔" بے تابی دیکھ کر شربت بنا کر پیش کیا گیا۔ آپ اللہ اکبر کہہ کر اٹھ بیٹھے اور کپڑے بدل کر صرف ایک کمبل آدھے جسم پر لپیٹ لیا۔ شربت کا گلاس لے کر اللہ اکبر کہا اور پی لیا۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر لیٹ گئے اور اللہ اکبر کے ساتھ ہی روح نے جسم کو چھوڑ دیا۔ تاریخ وصال ۵ صفر المظفر سنہ ۱۳۱۱ھ تھی۔

جس دن مستان بابا صاحب اس دنیا سے رخصت ہونے والے تھے، اسی صبح حضرت خواجہ علی امیر الدین مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ آدھ گھنٹے تک دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ اٹھتے وقت خواجہ صاحب نے بآواز بلند مستان بابا سے کہا کہ آج آپ تشریف لے جا رہے ہیں اور میں آپ کے ایک دن بعد آجاؤں گا۔ ایک سال بعد ۲۶۔ ربیع الثانی کی صبح سے خواجہ صاحب نے بار بار یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم بابا صاحبؒ (بابا تاج الدینؒ) کی چھبیسویں کی فاتحہ میں جا رہے ہیں، اب واپس نہ آئیں گے۔ جو بھی آپ سے ملنے آتا، آپ یہی کہتے۔ شام کو جب آپ کو تاج آباد لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ یکایک پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ لوگ دوڑ کر کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ پلنگ پر سجدہ کی حالت میں پڑے ہیں اور روح پرواز کر چکی ہے۔

مہاراجہ رگھوجی راؤ

حکمراں مرہٹہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ مہاراجہ جانوجی راؤ کے ولی عہد تھے جن کی حکومت شرقاً غرباً وردھا ندی سے مہاندی بنگال تک اور شمالاً جنوباً گوداوری ندی کے قریب دیوار سے نربدا ندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراجہ جانوجی راؤ کو حکومت برطانیہ سے پولیٹیکل پنشن ملتی تھی۔ پولیٹیکل پنشن کے علاوہ بہت سے گاؤں بھی اس خاندان کی ملکیت تھے۔

راجہ رگھوجی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آپ بابا تاج الدین کو پاگل خانے سے ضمانت پر رہا کرا کے اپنے محل لے گئے۔ اس کا حال ابتدا میں درج کیا جا چکا ہے۔ شکردرہ محل میں راجہ رگھوجی نے بابا صاحب کو ہر طرح کا آرام و آسائش بہم پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ راجہ صاحب نے جس طرح بابا صاحب کی خدمت کی وہ ایک مثال ہے۔ انہوں نے اپنا محل، اپنے خدام، اپنا سب کچھ بابا صاحب کے لئے وقف کر دیا تھا۔

راجہ صاحب باباجی کو ایک دیوتا کا درجہ دیتے تھے اور ان کے سامنے کوئی عرض پیش کرتے تو اس طرح جیسے ایک دیوتا کے آگے پیش کرتے ہیں۔ ایک دفعہ بابا صاحب نے راجہ کے مندر کا بُت توڑ ڈالا۔ پجاریوں نے شور مچا دیا۔ راجہ صاحب سے شکایت کی گئی تو انہوں نے مسکرا کر صرف اتنا کہا۔ "بابا صاحب بھی دیوتا ہیں۔ یہ معاملہ دیوتاؤں کا ہے۔ آپس میں خود نمٹ لیں گے۔ ہمارا تمہارا بولنا بے ادبی ہے۔"

خود بابا تاج الدینؒ کو راجہ صاحب سے جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ راجہ صاحب کو اپنا "بڑا بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ پاگل خانے

سے نکلنے کے بعد بابا صاحب کچھ دن شکردرہ میں راجہ صاحب کے پاس رہے۔ پھر واکی تشریف لے گئے۔ واکی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد بابا صاحب دوبارہ شکردرہ چلے گئے۔ یہ شاید راجہ صاحب کا خلوص اور ان کی محبت تھی جن کی پذیرائی میں بابا صاحب نے دوبارہ شکردرہ کو اپنا مسکن بنایا۔

بابا صاحب کی ذات استغنا کی مکمل تصویر تھی۔ بابا صاحب ہر علائق سے آزاد سر برہنہ اور پا برہنہ گھومتے اور لوگوں کی داد رسی فرماتے۔ اگرچہ بڑے بڑے اُمرا اور رؤسا آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور چاہتے کہ بابا صاحب ان کی نذر یا خدمت کو قبول کر لیں۔ لیکن بابا صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ایک بار نظامِ دکن نے کچھ زمین بابا صاحب کو نذر کرنی چاہی تو آپ نے ملکیت کے کاغذات پھاڑ ڈالے۔ بابا صاحب کے اس طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بابا صاحب نے مہاراجہ رگھوجی جیسے راجہ کی خدمت قبول کی تو اس سے راجہ صاحب کی شخصیت کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ آخری زمانے میں جب کچھ لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ بابا صاحب شکردرہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں تو راجہ صاحب یہ سُن کر آزردہ خاطر ہو گئے لیکن بابا صاحب نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا۔

"تیرے گھر سے میرا بستر لاکھوں برس نہیں اٹھ سکتا۔"

شکردرہ محل میں بابا صاحب کا رہائشی کمرہ، پلنگ اور دیگر جگہیں ایک یادگار کی طرح محفوظ ہیں اور زائرین لازماً شکردرہ محل میں حاضری دیتے ہیں جو بابا صاحب کی چلہ گاہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

حضرت فتح محمد شاہ

جب بابا تاج الدین اولیاءؒ پاگل خانے سے شکردرہ راجہ رگھوجی راؤ کے پاس جانے لگے تو فرمایا "یہ جگہ خالی نہ رہے گی" بابا صاحب کا یہ فرمان حضرت فتح محمد شاہ صاحب کے ذریعے پورا ہوا۔

فتح محمد شاہ صاحب افغانستان سے آکر ضلع واردھا کے ایوت محل میں مقیم تھے اور وہاں ایک مسجد میں جاکر عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ ابھی یہ معمول جاری تھا کہ اُن پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ جذب کی کیفیت سے پہلے بھی بابا صاحب کی خدمت میں پاگل خانے آتے تھے اور بابا صاحب کے حکم سے واردھا تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت فتح محمد شاہ صاحب پر جذب کی کیفیت روزافزوں ہونے لگی تو لوگوں نے آپ کو پاگل سمجھ کر ناگ پور کے پاگل خانے میں داخل کرادیا۔ جس دن آپ کو پاگل خانے میں داخل کیا گیا اسی دن بابا تاج الدینؒ پاگل خانے سے شکردرہ تشریف لے گئے۔

ابھی حضرت فتح محمد شاہ صاحب کو پاگل خانے میں وارد ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ آپ کی شہرت ایک پہنچے ہوئے شخص کی حیثیت سے ہونے لگی۔ بابا تاج الدین کے وصال کے بعد مہاراجہ رگھوجی پاگل خانے گئے تاکہ حضرت فتح محمد شاہ صاحب کی ضمانت پر رہا کراکر شکردرہ لائیں۔ جب راجہ صاحب نے فتح محمد شاہ صاحب سے یہ بات کہی تو انہوں نے جواب دیا "وہ جگہ تو سر کے بل چلنے کی ہے اور تو مجھے آج ہی وہاں لے جانا چاہتا ہے۔" چنانچہ آپ عمر بھر پاگل خانے میں رہے۔ وصال کے بعد آپ کا

جنازہ تاج آباد لایا گیا تو آپ کی یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ جگہ تو سر کے بل چلنے کی ہے اور تو مجھے "آج ہی" وہاں لے جانا چاہتا ہے یعنی جیتے جی میں اس جگہ جانے کے قابل نہیں ہوں۔

حضرت کملی والے شاہ

بابا تاج الدینؒ نے آپ کو گوڈر شاہ کا خطاب دیا تھا۔ عالم، فاضل اور عبادت گزار تھے۔ جب بابا صاحب کی خدمت میں شکردرہ آئے تو ایک جھونپڑے میں عزلت نشینی اختیار کرلی۔ کسی کو جھونپڑے کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ لوگ آپ کی غذا جو دال کا پانی ہوتی تھی اور چائے اندر سرکا دیتے تھے۔ ایک دن بابا تاج الدین ان کے جھونپڑے کے پاس سے گزرے اور کہا "دروازہ کھول دو۔"

جب دروازہ کھول دیا گیا تو کملی والے شاہ صاحب نے سماع کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ ایک غزل شروع کی گئی اور آپ خوش و خرم اور مسرور بیٹھے سنتے رہے۔ دوران غزل یہ مصرعہ آیا کہ

اِدھر خیال چلا اور اُدھر چلی لیلیٰ

یہ سنتے ہی آپ نے ایک نعرہ بلند کیا اور لیٹ گئے۔ جب تیسری بار یہ مصرعہ پڑھا گیا تو آپ کی رُوح پرواز کر گئی۔ شکردرہ کے تالاب کے کنارے دفن کئے گئے۔

حضرت رسول بابا

بابا تاج الدین کی خدمت میں ایک صاحب اکثر حاضر ہوتے جو ذات کے

کومٹی (بنیا) تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اکثر دعا کی درخواست کرتے۔ کئی دفعہ عرض کرنے کے بعد باباصاحب نے فرمایا: "پہلا بچہ ہمارا ہوگا۔ جب لے آ!"

نو ماہ بعد وہ صاحب ایک لڑکے کے باپ بن گئے۔ حسبِ وعدہ انہوں نے نوزائیدہ کو باباصاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ باباصاحب نے بچے کا نام "رسول" رکھا اور پرورش کے لئے اپنے ماموں عبدالرحمٰن صاحب کے حوالے کر دیا۔

رسول بابا پیدائشی مجذوب صفت تھے۔ باباصاحبؒ کے پاس آتے تو آپ کے گرد پروانے کی طرح چکر کاٹتے۔ اکثر آپ مستانہ انداز میں "یا تراب"، "یا تراب" کا نعرہ لگاتے۔

باباتاج الدین کے دربار سے آپ کو یہ خدمت سپرد ہوئی تھی کہ جو بھی آسیب زدہ دربار تاج الاولیاء میں آتا اور یہاں بھی ٹھہرتا، آپ اسی وقت وہاں پہنچ جاتے اور اس کو ٹھیک کر دیتے۔ باباتاج الدین کے وصال کے بعد آپ کا وصال ۸۰ سال کی عمر میں ہوا اور باباصاحب کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔

حضرت مسکین شاہ

آپ کا اصل نام غلام مصطفیٰ تھا اور آپ شطاریہ اور قادریہ سلسلے سے نسبت رکھتے تھے۔ آپ کے پیرومرشد نے باباتاج الدین کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ باباتاج الدین کے حکم کے مطابق آپ ناگپور پولیس لائن ٹاکلی کی مسجد میں پیش امام ہو گئے اور باباصاحب کی نسبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت مسکین شاہ کی

طبیعت میں عجز وانکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد باباصاحب نے ان کو سکندرآباد، بلند شہر روانہ کر دیا۔ اور آپ نے وہاں رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق کا مشن جاری کیا۔

حضرت اللہ کریم

شکردرہ کے رہنے والے دیکھتے تھے کہ شکردرہ کے صدر دروازے پر ایک شخص ٹن کا ڈبہ اور ایک رکابی ہاتھوں میں لئے کھڑا رہتا ہے اور وقفے وقفے سے صدا لگاتا ہے:

"اللہ کریم آیا ہے، باسی کھانا مانگتا ہے۔"

جب کوئی کھانا پیش کرتا تو وہ شخص رکابی میں کھانا اور ٹن کے ڈبے میں پانی لے لیتا۔ یہ لوگ انہیں اللہ کریم کہتے تھے۔ حضرت اللہ کریم کو کمبل یا کوئی کپڑا نذر کیا جاتا تو آپ بازار لے جا کر اُسے فروخت کر دیتے اور جو پیسے ملتے انہیں محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔

لوگ یہ بھی دیکھتے کہ صدر دروازے پر دربان کی طرح کھڑے ہوئے اللہ کریم کبھی کبھی یکایک مؤدب ایستادہ ہو جاتے اور بآوازِ بلند پکارتے:

"خبردار ہو جاؤ، لال بنگلہ آتا ہے۔"

دس پندرہ منٹ بعد شکردرہ کے محل سے حضور باباتاج الدین باہر آتے۔ گویا آپ پہلے سے لوگوں کو باباصاحب کے آنے کی اطلاع کر دیتے تھے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔ اسی طرح جب باباصاحب کی سواری سامنے سے گزرتی تو حضرت اللہ کریم فوجی انداز سے سیلوٹ کرتے اور جب تک باباصاحب واپس نہیں آتے، دروازے

پر اس طرح موجود رہتے جیسے نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔

حضرت اللہ کریم کا وصال بابا صاحب کے پردہ فرمانے کے چند دن بعد ہوا اور تاج آباد کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

حضرت بابا عبدُ الرحمٰن

آپ مدراسی پلٹن میں ملازم تھے۔ وہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ بعد میں آپ نے کسی بحری جہاز پر نوکری کر لی۔ ایک بار سفر کرتے ہوئے جہاز پر سے پانی میں گر گئے۔ بابا تاج الدین سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے آپ نے بابا صاحب کا تصور کیا تو نامعلوم طریقے سے کنارے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے پیدل ہی بابا تاج الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بابا تاج الدین کی توجہ سے آپ پر جذب طاری ہوگیا۔ بابا صاحب نے آپ کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ اور اسی نام سے آپ مشہور ہوئے۔ جب آپ پر استغراق کا غلبہ ہوا تو کپڑوں سے بے نیاز ہو کر ایک قبرستان میں رہنے لگے۔ ایک دن جب آپ نے بےخودی کی حالت میں بابا صاحب کے پاس پہنچے تو بابا صاحب نے ایک کپڑا عطا کر کے احرام باندھنے کا حکم دیا۔ احرام باندھتے ہی جذب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بابا تاج الدین نے آپ کو گاڑھا گھاٹ کامٹی جاکر ہریجنوں کے مندر میں رہنے کا حکم دیا۔

بابا عبدُالرحمٰن کامٹی کے مندر میں رہ کر راہِ حق کے متلاشیوں کو راستہ دکھانے لگے اور پریشان حالوں کی دادرسی آپ کے ذریعے ہونے لگی۔ مندر کا انتظام و انصرام ایک ہریجن خاتون کرتی تھی۔ وہ بھی بابا عبدالرحمٰن کے ہاتھوں پر بیعت ہو گئی۔

ابھی خدمت کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ بابا عبدالرحمٰن کی طبیعت خراب ہو گئی۔ آپ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا صاحب نے کہا: "آپ پہلے جائیں میں بھی آرہا ہوں"۔

چنانچہ بابا تاج الدین کے وصال سے تین دن پہلے، ۲۳۔ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ کو بابا عبدالرحمٰن اس دنیا سے پردہ کر گئے۔ آپ کی تدفین سرگودہ کے تکیے میں کی گئی۔

حضرت بابا عبدُ الکریم

آپ کے والد حسن احمد صاحب ضلع مچھلی بندر کے انعام دار تھے۔ آپ کے پانچ بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ آپ پلٹن نمبر ۶۳ میں ملازم ہو گئے اور آپ کی تعیناتی ناگپور ہوئی۔ آپ جمناسٹک میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

کسی وجہ سے آپ نے اپنے والد کو خط میں سخت الفاظ لکھ دیئے جس سے حسن احمد صاحب ان سے ناراض ہو گئے۔ ادھر بابا عبدالکریم نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور کامٹی ندی کے کنارے ایک بزرگ کے مزار پر معتکف ہو گئے۔ ان بزرگ نے عالمِ بشارت میں ان سے کہا کہ اس زمانے میں بابا تاج الدین عارفین کے سردار ہیں، تم ان کی خدمت میں جاؤ۔

بابا عبدالکریم دربار تاج الاولیاء میں حاضر ہوئے۔ بابا صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا: "تم اپنے والد کی زیارت کر کے آؤ"۔

حکم کے مطابق والد کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ بابا صاحبؒ کی خدمت میں صرف چند ثانیوں کی حاضری نے آپ کے اندر عجیب تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

آپ زیادہ تر خاموش رہتے اور اکثر کھانا کھانا بھی بھول جاتے۔ نزول پہنچ کر بابا عبدالکریم اپنے والد سے ملے اور وہاں سے واپس بابا صاحبؒ کی خدمت میں واکی آگئے۔

بابا تاج الدین نے بابا عبدالکریم کا نام محمد حسین رکھا۔

ایک دفعہ ناگپور میں طاعون کی وبا بہت شدت سے پھیلی۔ ہزاروں افراد موت کا لقمہ بننے لگے۔ بابا تاج الدین نے محمد حسین بابا کو بلا کر کہا: "اونٹ پر بیٹھ کر ناگپور کی گلی گلی گھومو اور بلا کو بھگاؤ۔"

محمد حسین بابا اونٹ پر بیٹھ کر گلی گلی گھومنے لگے۔ لوگ کسی مریض کو آپ کے پاس لاتے تو آپ بابا صاحبؒ کا نام لے کر لعاب دہن طاعون کی گٹھی پر لگا دیتے اور مریض موت کے منہ سے نکل آتا۔ کچھ دنوں میں ناگپور سے طاعون کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے بعد طاعون نے شہر کو اپنا نشانہ نہیں بنایا۔

محمد حسین بابا کا وصال ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ آپ کا مزار شکردرہ کے باہر تاج آباد میں ہے جہاں آج بھی بابا تاج الدین کا عرس منایا جاتا ہے۔

حضرت حکیم نعیم الدینؒ

آپ کا تعلق مدراس سے تھا اور آباؤ اجداد فوجی تھے۔ حکیم صاحب کے چچا حیدرآباد دکن کے شاہی طبیب تھے۔ چچا نے بے اولاد ہونے کی وجہ سے ان کو لے کر پالا تھا۔ چچا نے آپ کو اچھی تعلیم دلوائی اور طب بھی پڑھائی۔ بابا تاج الدین کا ذکر سنا تو شوقِ دیدار میں واکی حاضر ہوئے۔ بابا صاحب نے فرمایا: "دنیا کا چند روزہ تماشہ دیکھ کر آؤ۔"
حکیم صاحب حیدرآباد واپس چلے گئے۔

کلیانی کے نواب حکیم صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنا معتمد بنالیا۔ اعتماد یہاں تک بڑھا کہ حکیم صاحب نواب صاحب کی جائداد کے مختار ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد نواب صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حکیم نعیم الدین کو بہت صدمہ ہوا اور بابا تاج الدین کے الفاظ یاد آئے کہ دنیا کا چند روزہ تماشہ دیکھ کر آؤ۔

حکیم نعیم الدین کلیانی سے حیدرآباد دکن چلے آئے اور ارادہ کیا کہ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن والدہ کی خدمت میں رکاوٹ کے خیال سے فی الوقت ارادہ ملتوی کر دیا۔ جب والدہ بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں تو اپنی جائداد اور سرمایہ رشتہ داروں اور غریبوں میں تقسیم کر کے فقیرانہ لباس میں دربار تاج الاولیاءؒ روانہ ہوئے۔ چلتے ہوئے آپ نے جھولے میں چچا کی مجرّب ادویات بھی رکھ لیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا بھی شریکِ سفر ہولیا۔

شکردرہ پہنچ کر آم کے درختوں کے نیچے قیام کیا۔ شریکِ سفر بوڑھے کے پاس جو روپیہ پیسہ تھا وہ راستے کے اخراجات میں ختم ہوگیا۔ دوسرے روز بھوک نے ستایا تو حکیم صاحب مٹی کا ایک ٹھیکرا لے کر قریبی لنگر پر گئے۔ لنگر تقسیم کرنے والا لوگوں سے درشتی سے پیش آرہا تھا۔ ان سے برداشت نہ ہوسکا اور خالی ہاتھ واپس چلے آئے وہ دن بھوکے رہ کر گزارا۔ اگلے دن ہمراہی بوڑھے نے بھوک کی شکایت کی۔ حکیم صاحب کے پاس کسی فقیر کی دی ہوئی اکسیر تھی اس سے ایک تولہ سونا تیار کیا اور بوڑھے کو دیا کہ بازار میں فروخت کر آؤ۔ ادھر بوڑھا بازار گیا، بابا تاج الدینؒ اپنی قیام گاہ سے نکل کر درخت کے نیچے آئے اور حکیم صاحب سے کہا: "عقبیٰ کا متلاشی دنیا لے کر آیا ہے۔"
یہ کہہ کر اکسیر بنانے کے سامان کو اوندھا کر دیا اور چلے گئے۔

کچھ دیر بعد بوڑھا بازار سے کھانے کا سامان لے کر آ گیا۔ حکیم صاحب نے بابا صاحب کی آمد کا حال کہہ کر بوڑھے کو واپس حیدر آباد بھیج دیا۔ اور وہ جھولا جس میں اکسیر وغیرہ رکھا ہوا تھا زمین میں دفن کر دیا۔ دو دن حکیم صاحب نے درخت کی پتیاں کھا کر گزارے۔ تیسرے روز وزیر نامی صاحب جو بعد میں وزیر بابا جھنڈے والے کے نام سے مشہور ہوئے وہاں آئے اور حکیم صاحب کو اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے لگے۔

رفتہ رفتہ لوگوں میں حکیم نعیم الدین صاحب کی شہرت ہونے لگی اور لوگ آپ کی عزت کرنے لگے۔ آپ کے لئے ایک جھونپڑی بھی بنا دی گئی جس میں آپ معتکف رہتے۔ بہت کم باہر نکلتے تھے۔ آپ کو بابا تاج الدین سے ایسی ذہنی نسبت ہو گئی تھی کہ جب لوگوں کو بابا صاحب کی کہی ہوئی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو آپ سے رجوع کرتے۔ آپ فوراً اُس کا مطلب بتا دیتے تھے۔

وصال کے دن آپ نے کہہ دیا تھا کہ آج ہماری روانگی ہے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ گھنٹے، آدھ گھنٹے بعد آنکھیں کھول کر پوچھتے، "کتنا بجا ہے؟" شام کو پانچ بجے کے قریب پھر یہی سوال کیا تو بتایا گیا کہ پانچ بجے ہیں۔ یہ سن کر حکیم صاحب نے بلند آواز سے کہا: لا الٰہ الا اللہ، پیرو نبی جی صلی اللہ"۔ تیسری دفعہ یہ کہنے کے ساتھ ہی آپ کی رُوح پرواز کر گئی۔ حکیم نعیم الدین صاحب کا مزار ناندورا میں گیان ندی کے کنارے واقع ہے۔

حضرت محمد عبدالعزیز عرف نانا میاں

حضرت محمد عبدالعزیز مدراسی تھے اور آپ کے والد کا تعلق فوج سے تھا۔ ان

کی سرگزشت جو خود انہوں نے بیان کی، یوں ہے :-

میں رائے پور میں سکونت پذیر تھا۔ یہاں اکثر مشائخ آتے اور کوشش کرتے کہ میں ان کا مرید ہو جاؤں لیکن میں انکار کر دیتا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ جلوہ فرما ہیں۔ ان کے ایک طرف پانی بہہ رہا ہے اور دوسری طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور بزرگ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔

"یہ ہے تمہارا راستہ!"

میں بیدار ہوا تو دل سکون و اطمینان سے سرشار تھا۔ اس دن کے بعد میں اکثر اس خیال میں رہتا کہ جن صاحب کی میں نے خواب میں زیارت کی ہے، ان سے نہ جانے کب ملاقات ہو۔ اس زمانے میں میرے چند دوست ناگپور کے پاگل خانے میں بابا تاج الدین کے پاس گئے اور ان کے اندر ہونے والی تبدیلی کو میں نے بخوبی محسوس کیا۔ نیز اور بہت سے لوگوں سے بابا صاحب کی شخصیت اور کرامات کا تذکرہ سن کر میرے دل میں بھی زیارت کا اشتیاق ہوا۔

واکی میں بابا صاحب کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ بابا صاحب نے ایک تنکا اٹھایا۔ اور اپنی ران پر آہستہ آہستہ لکھنا شروع کیا۔ میں آپ کے ہاتھ کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ بابا صاحب نے اپنی ران پر میرا پورا نام مع ولدیت کے لکھ دیا۔ جب کہ میں پہلی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور آپ سے بات تک نہیں کی تھی۔ اسی وقت مجھے اپنا خواب یاد آ گیا اور میں نے پہچان لیا کہ میں نے خواب میں جن بزرگ کی زیارت کی تھی وہ بابا تاج الدین ہی تھے۔

میں اکثر بابا تاج الدین کی خدمت میں میلاد شریف پڑھتا تھا۔ ایک دن بابا صاحب

نے کہا: "کتاب لاؤ" میں کتاب لے کر بابا صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے ایک صفحہ کھول کر بطور نشانی لکڑی کی سیک اس پر رکھ دی اور فرمایا: "یہ تمہارا ترک ہے" یہ الفاظ سنتے ہی میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ مجھے دنیا اور دنیا کے معاملات ہیچ دکھائی دینے لگے۔ میرے ذہن میں ترکِ دنیا کا خیال آیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ سب کچھ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاؤں گا۔ یہ خیالات ہر وقت میرے ذہن میں گشت کرنے لگے۔ چند دن بعد بابا تاج الدینؒ نے دوبارہ کتاب طلب کی اور اس پر تحریر فرمایا: "چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر" اور کتاب مجھے دیتے ہوئے فرمایا: "ترک کو سمجھو"

اگلے روز بابا صاحب نے اپنے روحانی تصرف سے مجھے سمجھایا کہ ترک کیا ہے اور میں سمجھ گیا کہ ترک، دنیا کو چھوڑ دینے کا نام نہیں بلکہ ان خیالات سے نجات حاصل کرنے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ فوراً ہی میرے دل سے دنیا چھوڑنے کا خیال ختم ہو گیا اور میں بابا صاحب کی اجازت سے اپنے وطن رائے پور چلا گیا۔

رائے پور میں میری تنخواہ میں بتدریج اضافہ ہونا شروع ہوا اور یہ اضافہ اسی شرح سے ہوا جو بابا صاحب نے میری کتاب پر تحریر کیا تھا۔ ۲۵ روپے سے بڑھ کر میری تنخواہ چالیس روپے ہوئی۔ پھر پچاس، پھر ساٹھ اور پھر ستر روپے ہو گئی۔ رائے پور میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد میں اپنی اہلیہ کے ساتھ واکی گیا۔ وہاں دستور تھا کہ ہر شخص کھانا پکا کر بابا صاحب کی خدمت میں پیش کرتا۔ ایک دن میں نے بھی کھانا تیار کروایا اور بابا صاحب کی رہائش گاہ کی جانب گیا۔ پتہ چلا کہ بابا صاحب ندی کی طرف گئے ہیں۔ میں ندی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ بابا صاحب چاروں طرف پردہ تان کر اندر بیٹھے

ہوئے ہیں۔ اور ہر شخص کا لایا ہوا کھانا پیش کیا جا رہا ہے۔ میرا توشہ دان بھی پیش کیا گیا۔ لیکن بابا صاحب نے کسی بھی توشہ دان کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ قریب ہی ایک ہندو لڑکا کھانا پکا رہا تھا۔ اس نے ایک تھالی میں زرد رنگ کی نہ جانے کیا چیز نکالی اور ہاتھ میں گوار کی پھلیاں نکال کر بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیں بابا صاحب نے تھالی لے کر یہ کھانا نہایت خوشی اور رغبت سے کھانا شروع کیا۔ پھر پردے کو سرکا کر میری طرف دیکھا اور کہا: "آؤ یہ کھانا کھا لو۔ تمہارے کام کی چیز ہے۔" میں نے دوڑ کر تھالی ہاتھ میں لے لی۔ دیکھا کہ کھانے کے ساتھ بہت سی چیزیں شامل ہیں؟ موز کے چھلکے، بیڑی کے ٹکڑے اور کچھ کنکر، پتھر۔ میں یہ کھانا بہت شوق سے کھانے لگا۔ تبرک کا بہت سے لوگ میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دیکھنے میں وہ بیڑی کے ٹکڑے اور کنکر پتھر دکھائی دیتے تھے لیکن منہ میں جانے کے بعد وہ کوئی اور چیز ثابت ہوتے تھے۔ جن کا ذائقہ ناقابلِ بیان ہے۔

ایک دفعہ مئی کے سخت گرم مہینے میں بابا تاج الدینؒ جنگل میں بہت دور تک چلے گئے۔ ساتھ جانے والے ایک صاحب چھتری بابا صاحب کے سر پر پھیلائے چل رہے تھے تاکہ آپ کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو۔ مجھ سے یعقوب نامی خادم نے کہا: "آپ بھی چھتری پکڑ کر خدمت میں شریک ہو جائیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے چھتری ہاتھ میں لے لی۔ اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے بابا صاحب کو دیکھا تو آپ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی اور اس درجہ خود فراموشی کے باوجود آپ اس طرح تیز تیز چلے جا رہے تھے جیسے پوری طرح باہوش ہوں۔ آپ کانٹوں، پتھروں سے بے پروا یوں چل رہے تھے جیسے وہ آپ کے راستے میں نہ ہوں۔ میں نے قدموں پر نگاہ کی تو ایسا لگا جیسے بابا صاحب

تا زمین سے کچھ اوپر فضا میں معلق چلے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے راستے میں ایک پتھر آیا جو زمین میں گڑا ہوا تھا۔ وہاں بابا صاحب رُک گئے۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ایسے رہتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔"

ایک دفعہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں میں دنیاوی مسائل کا شکار تھا۔ اور میرا ذہن ہر وقت ان ہی مسائل میں الجھا رہتا تھا۔ یکایک بابا صاحب خود آئے ہوئے اور میرے پاس آ کر کہا: "حضرت! پنجرے سے کبوتروں کو اڑا دو۔" یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔ جیسے ہی آپ واپس ہوئے میرے ذہن میں ایک کوندے کی طرح ان الفاظ کے معانی آ گئے۔ بابا صاحب نے میرے دل کو پنجرہ کہا تھا اور خیالات کو کبوتروں کے ہم معنی قرار دیا تھا جو ہر وقت میرے دل میں گشت کرتے رہتے تھے۔ پنجرے سے کبوتر اڑا دینے کا مطلب یہ تھا کہ میں ان سے ذہن ہٹا کر یکسو ہو جاؤں کیوں کہ یکسوئی ہر معاملے میں کامیابی کی کلید ہے۔

اب میں بابا صاحب کے اشارے کے مطابق ستر روپے ماہوار پر ملازم ہو چکا تھا۔ میرے رشتے داروں نے مجبور کیا کہ اگر تم اگلا امتحان پاس کر لو تو تمہاری تنخواہ چار سو روپے کے قریب ہو جائے گی۔ میں ۱۹۲۲ء میں ناگپور آیا تاکہ امتحان دے سکوں۔ شکر درہ میں حضور بابا صاحب کے پاس حاضر ہوا تو بابا صاحب نے فرمایا: "صوبے دار کی لال کتاب پڑھتے ہیں، گھر جاتے ہیں۔" میں بہت خوش ہوا کہ بابا صاحب نے امتحان میں کامیابی کی خوش خبری دے دی ہے۔ اگلے ہی روز میں پیچش میں مبتلا ہو گیا اور اس شدت کی تکلیف ہوئی کہ میں امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ میں ناگپور سے جوں ہی رائے پور واپس پہنچا، میری تکلیف فوراً ختم ہو گئی۔ ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وہاں کے

ایک بزرگ حضرت عبداللطیف نے مجھ سے کہا: "عبدالعزیز! تم نے قرآن شریف نہیں پڑھا ہے، پڑھ لو اور نماز پڑھا کرو۔" میں اب تک ایک ان پڑھ قسم کا شخص تھا۔ اور مجھے نماز تک نہیں آتی تھی۔ عبداللطیف صاحب کے ساتھ مسجد گیا اور لوگوں کی نقل کرتے ہوئے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد عبداللطیف صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اور قرآنِ پاک کھول کر میرے سامنے رکھا اور حکم دیا: "پڑھو۔" مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں جس لفظ پر نظر ڈالتا وہ از خود میرے ذہن میں آ جاتا اور میں پڑھ دیتا۔ یہاں تک کہ میں بارہ صفحے تک تلاوت کر گیا۔ عبداللطیف صاحب نے مجھ سے کہا کہ عبدالعزیز، تم نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی، تمہیں تو قرآنِ مجید کی تلاوت بحُسن و خوبی آتی ہے۔ تب میں نے عبداللطیف صاحب کو وہ پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح بابا تاج الدینؒ نے مجھ سے کہا تھا کہ صوبے دار کی لال کتاب پڑھا کرو۔ یہ سن کر عبداللطیف صاحب پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور فرمایا کہ یہ حضور بابا صاحبؒ کا تصرف ہے کہ تم لمحہ بھر میں قرآن پاک پڑھنے پر قادر ہو گئے ہو حالاں کہ تم نے آج سے پہلے کبھی قرآن پاک کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔

بابا تاج الدینؒ کا حضرت عبدالعزیز صاحب پر یہ تصرف مستقبل میں بھی جاری رہا اس طرح کہ آپ کند ذہن لوگوں کو بھی پندرہ دن کے اندر قرآن ختم کرا دیتے تھے۔ لوگ دُور دُور سے ان کے پاس آتے اور دس پندرہ دن میں قرآنِ پاک ختم کر کے چلے جاتے۔

نیتا آنند بابا نیل کنٹھ راؤ

آپ مرہٹہ قوم کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ مدراس کے

رہنے والے تھے اور جبل پور کے کسی آفس میں کلرک تھے۔ بابا تاج الدینؒ سے گہری عقیدت تھی۔ بابا صاحب سے دلی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ بابا صاحب کا فوٹو پاس رکھتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ ایک دن فوٹو سامنے رکھے ہوئے ہدیہ عقیدت پیش کر رہے تھے کہ منظر بدل گیا۔ دیکھا کہ نہ فوٹو سامنے ہے اور نہ آپ اپنے مکان میں موجود ہیں بلکہ تاج الدین بابا ایک عجیب شان سے جلوہ افروز ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر نیل کنٹھ راؤ صاحب بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد وارفتگی اور جذب میں شکر درہ بابا تاج الدین کے پاس پہنچے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ مست و بے خود بابا صاحب کی شان میں گیت گاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ شکر درہ میں رہنے کے بعد بابا نیل کنٹھ راؤ جبل پور چلے گئے۔ جبل پور میں ہزاروں لوگوں نے آپ سے فیض پایا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی سمادھی ناگ پور میں موجود ہے۔

سکّو بائی

شکر درہ میں بابا تاج الدینؒ کے پاس گلاب نامی ایک بنجارہ (روئی دھنکنے والا) آیا۔ اس نے بابا صاحب سے عرض کیا: "حضرت! میں دونوں آنکھوں سے معذور ہوں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

بابا صاحب نے فرمایا: "اپنے گاؤں میں چراغ رکھ کر یہاں کیوں آیا ہے؟ جا، اور مجھے وہاں دیکھ!"

گلاب اپنے گاؤں واپس گیا اور گھر میں بیٹھا بابا صاحب کے ارشاد پر غور کر رہا

تھا کہ آنکھوں پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ گلاب نے آثار و شواہد سے اندازہ لگا لیا کہ یہ سکّو بائی ہیں۔ اس وقت سکّو بائی کا بچپن تھا۔ گلاب سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو، بابا صاحب نے جس شخصیت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ سکّو بائی ہی ہیں۔ ورنہ بغیر بلائے آنے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے کی کیا وجہ ہے۔

سکّو بائی گلاب کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں اور پھر بتدریج گلاب کی بینائی بڑھتے بڑھتے بحال ہو گئی۔ اس واقعہ سے سکّو بائی پورے گاؤں میں مشہور ہو گئیں اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ آپ کے پاس آنے لگے۔

سکّو بائی کنبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور پیدائشی مجذوب اور ولی اللہ تھیں۔ آپ ضلع وردھا میں مستی ماں کے نام سے مشہور ہوئیں۔

بی امّاں صاحبہ

آپ کے والد چاندہ میں مسجد کے پیش امام تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ پیش امام صاحب کی بیوی نے منت مانگی کہ اگر اولاد زندہ رہ گئی تو میں اسے بابا صاحبؒ کے زیرِ سایہ دے دوں گی۔ چنانچہ بی امّاں صاحبہ پیدا ہوئیں اور زندہ رہیں۔ کم سنی میں اُن کو بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو بابا صاحب نے آپ کی پرورش اپنے ماموں عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کی۔ جب بی امّاں صاحبہ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ان کے رشتے دار انہیں چاندہ لے گئے اور شادی کر دی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بی امّاں صاحبہ پر استغراق کی کیفیت غالب رہنے لگی جس کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے دوبارہ بابا صاحب کے سامنے پیش کیا۔ چند روز بابا صاحب کے

پاس رہیں تو جذب ختم ہوگیا۔ باباصاحبؒ نے ان کی تربیت اور تعلیم فرمائی اور عبدالرحمٰن کا لقب دیا۔ بی اماں صاجبہ نے راجورہ میں قیام کیا اور وہیں آپ کا چشمۂ فیض جاری ہوا۔

حضرت دوّا بابا

آپ کا تعلق گورکھپور سے تھا۔ باباتاج الدینؒ کے وصال کے دن ناگپور آئے اور بعض لوگوں کے بیان کے مطابق تین دن بعد ناگپور آئے۔ آپ کو باباصاحبؒ سے رُوحانی نسبت حاصل تھی۔

حضرت دوّا بابا تاج آباد میں مقیم رہے اور لوگوں میں آپ کی عقیدت و محبّت گھر کرنے لگی۔ اسی زمانے میں آپ پر جذب طاری ہوگیا۔ یکایک جلال میں آکر لوگوں کو پتھر مارنے لگے۔ ان دنوں تاج آباد کا انتظام حضرت فریدالدین کے سپرد تھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی شخص دوّا باباصاحب کے ہاتھوں مارا جائے۔ حضرت فریدالدین باباتاج الدین کی طرف متوجہ ہوکر ان کے مزار کی پائنتی پر سوگئے۔ خواب میں اشارہ ملا کہ دوّا باباصاحب کو زنجیروں سے باندھ کر رکھاجائے حضرت فریدُالدین زنجیر لے کر دوّا باباصاحب کے پاس پہنچے۔ دوّا باباصاحب نے انہیں آتا دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیئے اور زنجیریں پہن لیں۔ لیکن رات کو نہ جانے کس طرح زنجیروں کی قید سے آزاد ہوکر تاج آباد سے باہر چلے گئے اور پندرہ دن بعد تاج آباد میں دوبارہ نظر آئے۔ حضرت فریدُالدین صاحب ان کے پاس اپنے عمل کی معافی مانگنے گئے۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ دوّا باباصاحب نے کہا: "تیری کوئی خطا نہیں ہے۔ سب باباصاحب کے زیرِ حکم ہیں۔"

ان دنوں ناگپور کے راجا اعظم شاہ لاولد تھے۔ دوّا باباصاحب کی دُعا سے ان کے ہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ راجا اعظم شاہ کی درخواست پر دوّا باباصاحب نے ان کے قلعے میں رہنا قبول کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد وہیں آپ کا وصال ہوگیا۔ آپ کا جسدِ خاکی راجا اعظم شاہ کے قلعے سے تاج آباد لایاگیا۔ اور وہیں آپ کا مزار ہے۔

جس طرح باباتاج الدین کی چلّہ گاہ راجا رگھوجی راؤ کے محل میں ہے اسی طرح دوّا باباصاحب کا چلّہ راجا اعظم شاہ کے محل میں موجود ہے۔

نانی صاحبہؒ

آپ مجذوب تھیں اور ایک فقیر خاندان سے تعلق تھا۔ اکثر مستانہ وار جھوم جھوم کر باباتاج الدینؒ کی شان میں اشعار گاتی تھیں۔ ایک لمبا کرتا اور لنگوٹ آپ کا لباس تھا۔ نانی صاحبہ کی کوئی بات رموز و نکات سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ آپ آخری وقت تک تاج آباد میں مقیم رہیں، وہیں وصال ہوا اور وہیں دفن کی گئیں۔

حضرت محمدغوث بابا

آپ مدراس سے تعلق رکھتے تھے اور شکر دَرہ میں اکھاڑے کے پیچھے ایک جھونپڑے میں آپ کا قیام تھا۔ آپ ایک عابد اور سالک تھے۔ اس لئے باباصاحبؒ نے آپ سے ارشاد و تبلیغ کا کام لیا۔ باباتاج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی مشن کو آپ نے ویجانگر اور کرنگ کے علاقوں میں پھیلایا۔ ان علاقوں کے عوام کے علاوہ بااثر

افراد بھی آپ سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت محمد غوث بابا نے اپنے ہاں ایک چھوٹا سا لنگر خانہ بھی قائم کر رکھا تھا جس سے درویشوں اور محتاجوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ ۳ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کو آپ دیجا نگر سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں انتقال ہوگیا اور جسدِ خاکی شکر درہ لایا گیا۔ بابا تاج الدینؒ کے حکم سے راجہ باگ سوار کی طرف سرگروہ کے تکیے میں سپردِ خاک کئے گئے۔

قاضی امجد علی

۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوگیا تو پھوپھی نے گود لے کر پالا۔ پھوپھی کا خاندان ناندورہ ضلع بلڈانہ (برار) میں آباد تھا۔ مڈل تک پڑھنے کے بعد آگے کی تعلیم کھام گاؤں میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جی آئی پی ریلوے میں ملازمت کی درخواست دی۔ ٹکٹ کلکٹر کی ملازمت مل گئی۔ اور جلد ہی ترقی کر کے بحیثیت گارڈ بھساول جنکشن پر تعینات کئے گئے۔

قاضی صاحب اپنے ایک ساتھی گارڈ سید محمد سبحان الدین صاحب کے ساتھ بابا صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ بابا صاحب نے آپ کو گیارہ روز تک اپنے پاس رکنے کا حکم دیا۔ گیارہویں دن صبح بابا صاحب رحمۃ نے کہا: "ریل پر جانے والوں کو بلاؤ"۔ بآوازِ بلند یہ بات پکاری گئی تو صرف قاضی امجد علی ریلوے سے متعلق نکلے۔ قاضی امجد علی بابا صاحب کے پاس پہنچے تو انھوں نے قاضی صاحب کے سر اور پشت پر دستِ شفقت پھیر کر کہا: "حضرت جاکو آؤ"۔ حسبِ حکم ناگ پور سے بھساول پہنچے۔ اگلے دن صبح ڈیوٹی

پر حاضر ہونا تھا۔ لیکن رات کو بابا صاحب نے بذریعۂ کشف حکم دیا: "واپس آتے جی حضرت"۔ آپ پہلی ٹرین سے ناگ پور روانہ ہوئے۔ بابا صاحب اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ بابا صاحب نے سر پہ ہاتھ پھیر کر دعا دی اور واپس جانے کا حکم دیا۔

بابا صاحب کے پاس قاضی صاحب کی ملازمت کا عجب حال ہوگیا۔ بابا صاحب حکم دیتے کہ یہیں رہتے جی تو آپ ملازمت سے بے نیاز ہو کر بابا صاحب کے پاس رہنے لگتے۔ اور جب واپسی کا حکم ملتا، دوبارہ ملازمت کی درخواست دیتے اور اسی عہدہ پر بحال کر دیئے جاتے۔ ایک مرتبہ رات میں بابا صاحب کی طرف سے حکم ہوا "حضرت یہاں آتے جی"۔ اگلی صبح ناگ پور تبادلے کا تار ملا۔ ناگ پور پہنچے تو بابا صاحب نے فرمایا، "ہاؤ جی حضرت! یہیں آم کے درخت کے نیچے رہتے، ہیٹیا را پکاتا، اپن کھاتے"۔ قاضی صاحب آم کے درخت کے نیچے ٹھہر گئے اور بابا صاحب انہیں نظرِ فیض سے نوازتے رہے۔

قاضی صاحب کی عمر ۲۸ سال کی ہوئی تو بابا صاحب نے پھول کا ہار، ایک کتاب اور ایک روپیہ عنایت کر کے کہا، "حضرت سنت کی پیروی کرتے جی، جاکو آؤ"۔ قاضی صاحب پھوپھی کے پاس ناندورہ پہنچے تو وہ ان کی شادی کے لئے منتظر بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

شادی کے دو سال بعد بابا صاحب نے قاضی صاحب سے کہا، "بہت کھانے لگا رے۔ آج سے تیرا کھانا بند"۔ تین کپ کالی چائے پیتے، اچھے رہتے۔ نو دن کے بعد بابا صاحب نے فرمایا، "اب تو ٹھیک ہوگیا رے"، کھاتے پیتے، اچھے رہتے۔ بابا صاحبؒ کے وصال کے بعد قاضی صاحب پر جذبی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

ایک روز بابا صاحبؒ نے حکم دیا، حضرت دنیا میں رہ کر دنیا کے کام کرتے، اچھے رہتے۔ چنانچہ ناگ پور سے نانده مگئے۔ ہومیو پیتھی کا کورس کر کے ڈاکٹری سند حاصل کی۔ اور علاج معالجے کے ذریعے خدمتِ خلق کی طرف رجوع ہوئے۔

بابا صاحبؒ کے حکم پر بمبئی گئے اور وہاں بھی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب پاکستان کا قیام وجود میں آیا تو قاضی صاحب کراچی آ گئے۔ اور بابا صاحب رح کی تعلیمات کو پھیلانے اور نذر و نیاز کا اہتمام جاری رکھا۔

وصال سے پہلے قاضی صاحب نے کھانا بند کر دیا۔ اور تیرہ دن تک کچھ نہیں کھایا۔ بالآخر ۱۵۔ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء قاضی صاحبؒ نے پردہ فرمالیا۔ سی۔ ون ایریا، لیاقت آباد کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے۔

حضرت فریدالدّین کریم بابا

آپ کاٹھیاوار کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بچپن ہی میں بابا تاج الدینؒ کے پاس حاضر ہو گئے تھے۔ بابا تاج الدینؒ سے مستفیض ہونے کے علاوہ آپ نے بابا صاحب کے دیگر فیض یافتگان سے بھی کسبِ فیض کیا۔ بابا صاحب کے حکم سے حکیم نعیم الدین صاحب کی خدمت میں رہ کر تصوف کے علاوہ طب اور دواسازی کی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ علی امیر الدین کے پاس بھی رہے۔ آپ کو بابا تاج الدین رح سے گہرا قلبی لگاؤ رہا۔ کریم بابا نے بابا تاج الدین رح کے حالات اور کشف و کرامات پر مبنی ایک کتاب "تاج مراری" بھی تالیف کی۔ آج کل آپ تاج آباد کمیٹی کے صدر ہیں۔ تاج آباد کمیٹی بابا تاج الدین کی درگاہ اور عرس کے انتظامات کرتی ہے۔

حضرت فریدالدین تاجی (کریم بابا صاحب) اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں: جھانسی سے ایک صوفی صاحب بابا صاحبؒ سے ملاقات کے لئے شکر درہ آئے۔ صوفی صاحب کا قیام میرے ساتھ تھا۔ اور ہم دونوں میں ہر وقت تصوّف اور رُوحانیت پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے شاہ صاحب سے پوچھا، کیا کوئی ایسا آسان طریقہ ہے جس کے ذریعے مجھ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ میں عرفان کی منزل کو تیزی سے عبور کر لوں۔ انہوں نے ایک عمل بتاتے ہوئے کہا کہ اس عمل کو کسی قبرستان میں کرو۔ جذبۂ شوق سے مغلوب ہو کر میں قبرستان جا کر یہ عمل کرنے لگا۔ تیسرے روز آنکھیں بند کئے اپنے عمل میں مشغول تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ بابا صاحب کی خفگی میں ڈوبی ہوئی آواز مجھے پکار رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو بابا صاحبؒ دکھائی نہ دیے۔ میں دوبارہ آنکھیں بند کر کے عمل میں غرق ہو گیا۔ جیسے ہی عمل شروع کیا، بابا صاحب رح کی غصہ بھری آواز کان میں پڑی۔ گویا آپ مجھے منع فرما رہے ہیں۔ میں فوراً اٹھا اور شکر درہ تالاب کے کنارے کنارے چلتا ہوا بابا صاحب کی نشست گاہ کی طرف بڑھا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ جوں ہی میں اپنے پرانے جھونپڑے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آم کے درخت کے نیچے بابا صاحب موجود ہیں۔ بابا نے مجھ سے کہا: "کیوں رے! کون بولا بڑے بڑے پہاڑاں کھودنے کو، یہ ماچس لے۔"

بابا صاحبؒ نے ماچس مجھے پکڑاتے ہوئے کہا: "کاہے کو رے اِدھر اُدھر ڈھونڈتا ہے۔" پھر آپ نے کچھ الفاظ ادا فرمائے جو میری سمجھ میں نہ آئے۔ دل ہی دل میں عرض کیا: "حضور! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے کیا فرمایا۔"

دل میں اس خیال کے آتے ہی باباصاحب نے ایک طمانچہ مجھے مارا اور فرمایا
"ذہن چُھوٹا ہے۔"

باباصاحب رح نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب کے کندھے سے شال لے کر دو پلّو میرے ہاتھ میں دیئے اور دو پلّو خود پکڑ کر فرمایا، اچھا۔ یہ ہے وکان سے

مثنوی ما و کانِ وحدت است　　　　وحدت اندر وحدت اندر وحدت است

جب باباصاحب نے مجھے ماچس دی تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جس طرح ماچس کی تیلی میں شعلہ نور چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ کا نور بھی میرے اندر موجود ہے۔ اللہ کو اپنے پاس رکھ کر اِدھر اُدھر ڈھونڈنا اور خود سے الگ سمجھنا لاحاصل ہے جب انسان خود کو پہچان لیتا ہے تو اس ہستی کا عرفان حاصل کر لیتا ہے جس نے خود کو متعارف کرانے کے لئے کائنات کو وجود کا لباس پہنایا ہے۔

قلندر بابا اولیاء

آپ کا نام محمد عظیم تخلص برخیا اور لقب قلندر بابا اولیاء ہے۔ قلندر بابا رشتے میں بابا تاج الدین ناگ پوریؒ کے نواسے ہیں۔

قلندر بابا اولیاءؒ ۱۸۹۸ء میں قصبہ خورجہ، ضلع بلند شہر، یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ پاک اور ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں حاصل کی۔ ہائی اسکول تک بلند شہر میں پڑھا۔ اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انٹر میں داخلہ لیا۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران آپ کی طبیعت میں درویشی کی طرف میلان پیدا ہو گیا۔ اسی اثنا میں قلندر باباؒ اپنے نانا بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نانا نے انہیں اپنے پاس روک لیا۔ قلندر بابا کے والد کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ ناگ پور گئے اور بابا تاج الدین سے عرض کیا: "اسے علی گڑھ واپس بھیج دیجئے۔ اس کی تعلیم نامکمل رہ جائے گی۔"

استادوں کے استاد، واقفِ اسرار و رموز، حاملِ علمِ لدُنّی بابا تاج الدین نے فرمایا کہ اگر اسے اس سے زیادہ پڑھایا گیا جتنا یہ اب تک پڑھ چکا ہے تو میرے کام کا نہیں رہے گا۔

قلندر بابا کے والد نے ایک مشفق باپ کی طرح بیٹے کو سمجھایا اور جب دیکھا کر بیٹے کا میلان فقر کی طرف ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر "بیٹے! تم خود سمجھ دار ہو جس طرح چاہو اپنا مستقبل تعمیر کرو" انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

قلندر بابا اولیاءؒ بابا تاج الدینؒ کے پاس نو سال مقیم رہے۔ بابا تاج الدین نے نو سال تک

ان کی روحانی تربیت فرمائی۔ تربیت کے زمانے میں ہونے والے بیشمار واقعات میں سے چند واقعات کا تذکرہ اور اس کی علمی توجیہ قلندر بابا اولیاءؒ نے کتاب "تذکرہ تاج الدین بابا" میں کی ہے۔

تربیت کے زمانے میں قلندر بابا کی والدہ سعیدہ بی بی چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ قلندر بابا اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی تربیت اور نگہداشت پر کمر بستہ ہو گئے اور جب بچیوں کی تربیت کے سلسلے میں دقت پیش آئی تو بابا تاج الدینؒ کے ارشاد کے مطابق ان کے ایک عقیدتمند کی صاحب زادی سے دہلی میں آپ کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد قلندر باباؒ دہلی میں قیام پذیر ہو گئے۔ سلسلۂ معاش قائم رکھنے کے لئے مختلف رسائل و جرائد کی صحافت اور شعراء کے دیوانوں کی اصلاح اور ترتیب کا کام اپنے لئے منتخب کیا۔

تقسیم ہند کے بعد قلندر بابا اپنے والد، بہن، بھائیوں اور اہل و عیال کے ساتھ کراچی آ گئے۔ اور لی مارکیٹ میں ایک خستہ حال مکان کرائے پر لیا۔ کچھ عرصہ بعد کمشنر بحالیات، خان بہادر عبد اللطیف نے جو بابا تاج الدینؒ کے عقیدتمند تھے، قلندر بابا سے کہا کہ ایک درخواست لکھ دیجئے تاکہ آپ کے لئے کوئی اچھا سا مکان الاٹ کر دیا جائے۔ قلندر باباؒ نے اس درخواست پر توجہ نہ دی اور اسی مکان میں رہتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد آپ 'اردو ڈان' میں سب ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک رسالہ نقاد میں کام کرتے رہے۔ کچھ رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے اور کئی مشہور کہانیوں کے سلسلے بھی قلم بند کئے۔

۱۹۵۶ء میں سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ، قطبِ ارشاد حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کراچی تشریف لائے۔ قلندر باباؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حضرت ابوالفیضؒ نے رات کو تین بجے آنے کو کہا سخت سردی کے عالم میں قلندر باباؒ گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کی سیڑھیوں پر رات کے دو بجے جاکر بیٹھ گئے۔ ٹھیک تین بجے سہروردی بزرگ باہر آئے اور ساتھ لے کر اندر کمرے میں پہنچے۔ سامنے بٹھا کر پیشانی پر تین پھونکیں ماریں۔ پہلی پھونک میں عالمِ ارواح منکشف ہوگیا، دوسری پھونک میں عالمِ ملکوت وجبروت سامنے آگیا اور تیسری پھونک میں قلندر بابا اولیاءؒ نے عرشِ معلیٰ کا مشاہدہ کیا۔

حضرت ابوالفیض سہرورد یؒ نے تین ہفتے میں قطبِ ارشاد کی تعلیمات دے کر خلافت عطا کردی۔ اس کے بعد شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی رُوح پرفتوح نے قلندر باباؒ کی روحانی تعلیم شروع کی اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہِ راست علم لدنی عطا فرمایا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہمت اور نسبت کے ساتھ بارگاہ ربّ العزّت میں پیشی ہوئی۔ اور اسرار ورموز کا علم حاصل ہوا۔ اس زمانے میں قلندر بابا اولیاءؒ نے مسلسل دس رات اور دس دن شب بیداری کی اور تہجد کی نوافل میں کئی کئی سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی۔

سلسلۂ عظیمیہ

ہر زمانے میں یہ طریقہ رہا ہے کہ جب طالبِ حق کسی عارف بزرگ سے بیعت ہوتا ہے تو وہ بزرگ کسی نہ کسی راستے سے قدم قدم چلا کر اُسے عرفانِ خداوندی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ اصول و قوانین اور رُوحانی راستے کسی سلسلے کا تعین کرتے ہیں۔ گروہ اولیاء اللہ میں سے منتخب

اور اکابر حضرات نے ہر زمانے میں طالبانِ حق کی عمومی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر اسباق اور اذکار مرتب کئے ہیں۔ ہر زمانے میں نوعِ انسانی کی شعوری، علمی اور جسمانی صلاحیتوں میں فرق رہا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ حالات اور ضروریات میں تبدیلی ہوتی گئی۔ چنانچہ یہ لازمی ہوگیا کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اسباق اور اذکار میں مناسب تبدیلی کی جائے تاکہ طالبانِ حق کو ان پر عمل پیرا ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔

علوم وفنون کی معجزہ صفت ترقیوں نے نوعِ انسان کی شعوری صلاحیتوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ انسان کی فکری سطح بھی بلند ہوگئی ہے۔ وہ کیوں اور کیسے کا جواب سننا چاہتا ہے۔ اس ذہنی ارتقا کے ساتھ یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ تصوّف کی تعلیمات اور روحانیت کے علم کو جدید نہج پر پیش کیا جائے۔ وہ علوم جنہیں کبھی وقت کی ضرورت کے تحت "علم سینہ" کہہ کر مخصوص حضرات کو منتقل کیا جاتا تھا۔ اب نوعِ انسان کا اجتماعی ذہن اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ ان علوم کو سُن اور سمجھ سکے۔ آج کے سائنسی دَور میں کوئی بات اس وقت قابلِ قبول ہوتی ہے جب اسے فطرت کے مطابق اور سائنسی توجیہات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ابدالِ حق قلندر بابا اولیاءؒ نے سلسلۂ عظیمیہ کی بنیاد رکھی تاکہ سلسلۂ عظیمیہ وقت کی ضرورت کو پورا کرے۔ سلسلۂ عظیمیہ کا مشن یہی ہے کہ لوگوں کے اوپر تفکر کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ حالات حاضرہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے سلسلۂ عظیمیہ نے اسباق اور اذکار میں تبدیلی کرکے اسے بہت مختصر اور آسان کردیا ہے۔

باباتاج الدین اولیاءؒ کے فیضِ روحانی اور علم معرفت کو سلسلہ عظیمیہ نے سائنسی بنیادوں پر نئے ڈھنگ اور نئی شان سے متعارف کرایا ہے۔ آنے والی نسل کے لئے روحانی سائنس ایک باقاعدہ تحریک بن گئی ہے باباتاج الدین ناگپوریؒ سے فیض یافتہ ان کے نواسے قلندر بابا کا مشن ہندوپاکستان سے نکلکر ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔

لوح وقلم

قلندر بابا اولیاءؒ نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے اس میں کتاب "لوح وقلم" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں روحانیت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں ترغیبی اور تبلیغی مواد موجود ہے لیکن ان قوانین اور فارمولوں کو بیان کرنے سے احتراز کیا گیا ہے جو تخلیق اور تسخیر کائنات سے متعلق ہیں۔ آج کے دور میں جب انسان کا ذہن بالیدگی کے اس نقطے پر پہنچ چکا ہے کہ وہ روحانیت کو علمی بنیادوں پر سمجھ سکے، قلندر بابا اولیاءؒ نے علم روحانیت اور کائنات کی تخلیق میں جاری وساری قوانین کو عام فہم زبان میں لکھوایا۔ اور اس طرح جو کتاب تیار ہوئی اس کا نام "لوح وقلم" رکھا گیا۔ لوح وقلم کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کے تخلیقی مراحل نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لکھوائی جو بطریقِ اویسیہ ملا۔

نقشے اور گراف

لوح وقلم کی اضافی تشریح کرتے ہوئے قلندر بابا اولیاءؒ نے بہت سے نقشے، تصاویر، اشکال اور گراف بنا کر دیئے۔ یہ اشکال اور نقشے ارض وسماوات اور عالم ملکوت وجبروت کے

تخلیقی فارمولوں پر مشتمل ہیں۔ نیز ان میں مقاماتِ ارضی وسماوی کا خاکہ بھی موجود ہے۔

رباعیات

قلندر بابا اولیاءؒ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ شعر وسخن کا ذوق آپ نے بچپن سے پایا تھا۔ قلندر باباؒ نے بہت سی رباعیات کہیں جن میں معرفت کے نکات، آدمِ خاکی کی حیثیت اور عالمِ رنگ وبُو کی حقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ان رباعیات میں جو گہرائی ہے وہ مقام ولایت و عرفان میں آپ کی عظمت کی گواہی دیتی ہے۔ چند رباعیات پیشِ خدمت ہیں:

جس پردے میں دیکھتا ہوں پردا ہے الگ
جس نقش میں دیکھتا ہوں نقشا ہے الگ
ہر ذرہ میں جمشید وفریدوں ہیں ہزار
سبحان اللہ کہ میری دنیا ہے الگ

❁

زلفیں ہیں ہزار مشک اور عنبر میں
ہیں سینکڑوں رخسار جو ہیں گوہر میں
اس راہ میں رکھ پیر ذرا آہستہ
آنکھیں ہیں ہزار پری زادوں کی خاکستر میں

نبی سے صادر ہونے والا معجزہ ہو یا ولی سے سرزد ہونے والی کرامت سب کسی نہ کسی قانون کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ سے متعلق تذکرے اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ ان حضرات کی اصل صفات چھپ گئی ہیں اور اس طرزِ فکر کو اجاگر نہیں کیا گیا ہے جو کشف وکرامت کی محرک ہوتی ہے۔ کشف وکرامت کے قانون یا کشف و

کرامت کی سائنس کو متعارف کرانے کیلئے ——— قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنے نانا بابا تاج الدین ناگپوریؒ کا تذکرہ بعنوان "تذکرہ تاج الدین بابا" لکھوایا۔ تذکرے میں ان واقعات کو بیان کیا ہے جو قلندر بابا اولیاءؒ کے سامنے پیش آئے۔

"تذکرہ تاج الدین بابا" کی افادیت کے پیش نظر ہم اس کتابچہ کو قلندر باباؒ کے تذکرے کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں تاکہ قارئین جو پوری کتاب سے گزر کر بابا تاج الدین کی ہمہ صفت ذات سے متعارف ہو چکے ہیں، اس تذکرے کو پڑھ کر حضرت بابا تاج الدین سے صادر ہونے والی کرامات کی علمی توجیہ سے بھی واقفیت حاصل کرلیں۔

تذکرہ

تاجُ الدّین باباؒ

(حصّہ اوّل)

قلندر حسن اخریٰ محمد عظیم برخیاؔ

(نواسا بابا صاحب)

شائع کردہ

مکتبہ تاج الدینؒ بابا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ایک مختصر تذکرہ ہے اس بات سے متعلق کہ اولیاء اللہ کس طرح سوچتے ہیں اور اُن کی باتوں کا اہم موضوع کیا ہوتا ہے۔ نانا تاج الدین کی کرامتوں کا تذکرہ سب سے پہلے گجراتی زبان کی ایک تالیف میں کیا گیا تھا۔ بعد میں ہندی اور اُردو میں وہ نسخے مرتّب ہوئے جن میں کچھ تو گجراتی زبان کی اس تالیف سے اخذ کیا گیا اور کچھ روایت کے طور پر بہت سے حضرات کے بیان کردہ واقعات اضافہ کئے گئے۔ تاہم کسی تذکرہ میں ان مخفی علوم کو نقطۂ نظر نہیں بنایا گیا تھا جن کا تعلق نانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذوقِ طبیعت اور قدرت کی رازداری سے ہے۔ وہ صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کر جاتے تھے جو براہِ راست قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ بعض اوقات اشاروں اشاروں ہی میں وہ ایسی بات کہہ جاتے جس میں کرامتوں کی علمی توجیہ ہوتی اور سننے والوں کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی کرامت کے اصولوں کا نقشہ آجاتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ اُن کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین من و عن ہر وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کرتے چلے جاتے ہیں جو نانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔ بغیر توجہ دیئے بھی ان کی غیر ارادی توجہ

دگوں کے اوپر عمل کرتی رہتی تھی۔ بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے بابا صاحب کے اس طرزِ ذہن سے بہت فیضان حاصل کیا ہے۔ یہ بات تو بالکل ہی عام تھی کہ چند آدمیوں کے ذہن میں کوئی بات آئی اور یکایک نانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دے دیا۔ اردو بولنے میں انہیں اکثر سوچنا پڑتا، پھر بھی الفاظ میں کچھ ایسا زور ہوتا کہ سامعین ان کا مافی الضمیر فوراً سمجھ جاتے۔

انسان، فرشتے اور جنات

مرہٹہ راجہ رگھو راؤ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کوئی درخواست کرتا تو اس طرح جیسے دیوتاؤں کے حضور میں۔ ایک مرتبہ انہوں نے راجہ کے مندر کا بت توڑ ڈالا۔ پجاریوں نے شور مچا دیا۔ لیکن راجہ صورتِ حال سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ محل والوں کی شکایت پر راجہ نے مسکرا کر فقط ایک جملہ کہا: "بابا صاحب بھی دیوتا ہیں۔ یہ معاملہ دیوتاؤں کا ہے، آپس میں خود نمٹ لیں گے۔ ہمارا تمہارا بولنا بے ادبی ہے۔" اس جملے سے محض راجہ کی عقیدت کا ہی نہیں، اس طرزِ فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو روحانی شخصیتوں کے بارے میں راجہ کے ذہن میں تھی۔ جو لوگ روحانی قدروں سے کچھ بھی مانوس ہیں وہ اتنا ضرور جان سکتے ہیں کہ راجہ مخفی علوم سے مس رکھتا تھا اور اس کے اندر فیضان حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ یہاں وہ چند باتیں پیش کرنا بھی ضروری ہیں جو میری موجودگی میں راجہ اور نانا رحمۃ اللہ علیہ میں ہوا کرتی تھیں۔ ان اوقات میں کوئی اور صاحب بھی سوال کر لیا کرتے اور پوری مجلس جواب سے مستفیض ہوتی۔ ایک مرتبہ مہاراجہ نے سوال کیا: "بابا صاحب! ایسی مخلوق جو نظر نہیں آتی مثلاً فرشتہ یا جنات، خبرِ متواتر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جتنی آسمانی کتابیں ہیں

ان میں اس قسم کی مخلوق کے تذکرے ملتے ہیں۔ ہر مذہب میں بد روحوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے لیکن عقلی اور علمی توجیہات نہ ہونے سے ذی فہم انسانوں کو سوچنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رکتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے۔ تجربات جو کچھ زبان زد ہیں، وہ انفرادی ہیں، اجتماعی نہیں۔ آپ اس مسئلہ پر کچھ ارشاد فرمائیں۔"

نانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں جو کچھ فرمایا وہ فقط تبصرہ نہیں بلکہ میرے اندازے میں ایسے الہامات کا مجموعہ ہے، قدرت نے ان کی ذات کو جن کا مرکز بنایا تھا۔ صاحبِ فراست انسانوں کے لئے یہ ملفوظات صد درجہ محلِ تفکر ہیں۔ ان کے جواب سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قدرت اور ان کے ذہن کی سطح قریب قریب ایک ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مسئلہ کی وضاحت جن خیالات کے ذریعہ کی گئی ہے وہ قدرت کے رازوں میں کس طرح سمائے ہوئے ہیں۔ جس وقت یہ سوال کیا گیا، نانا تاج الدین لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ اوپر تھی۔ فرمانے لگے: "میاں رگھو راؤ! ہم سب جب سے پیدا ہوئے ہیں، ستاروں کی مجلس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی رات ایسی ہو کہ ہماری نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھتی ہوں۔ بڑے مزے کی بات ہے، کہنے میں یہی آتا ہے کہ ستارے ہمارے سامنے ہیں، ستاروں کو ہم دیکھ رہے ہیں، ہم آسمانی دنیا سے روشناس ہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور ماہ و انجم کی کون سی دنیا سے روشناس ہیں۔ اس کی تشریح ہمارے بس کی بات نہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں، قیاس آرائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی سمجھتے یہی ہیں کہ ہم جانتے ہیں۔ زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ جانتا ہے تو یہ قطعاً نہیں سوچتے کہ اس دعوے کے اندر حقیقت ہے یا نہیں۔"

فرمایا: جو کچھ میں نے بتایا ہے سمجھو، پھر بتاؤ کہ انسان کا علم کس حد تک مفلوج ہے۔ انسان کچھ نہ جاننے کے باوجود اس کا یقین رکھتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ چیزیں دُور پرے کی ہیں۔ جو چیزیں ہر وقت انسان کے تجربے میں ہیں، ان پر بھی نظر ڈالتے جاؤ۔ دن طلوع ہوتا ہے۔ دن کا طلوع ہونا کیا شے ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ طلوع ہونے کا مطلب کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ دن رات کیا ہیں؟ اس کے جواب میں اتنی بات کہہ دی جاتی ہے کہ یہ دن ہے۔ اس کے بعد رات آتی ہے۔ نوعِ انسانی کا یہی تجربہ ہے۔

میاں رگھوراؤ، ذرا سوچو کیا سنجیدہ طبیعت انسان اس جواب پر مطمئن ہو جائے گا؟

دن رات، فرشتے نہیں ہیں۔ جنّات نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ مظاہر ہیں جن سے ایک فردِ واحد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ دن رات کو نگاہ دیکھتی ہے، اس لئے قابلِ یقین ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ نگاہ کے ساتھ فکر بھی کام کرتی ہے۔ اگر نگاہ کے ساتھ فکر کام نہ کرے تو زبان نگاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ نگاہ اور فکر کا عمل ظاہر ہے۔ دراصل سارے کا سارا عمل تفکّر ہے۔ نگاہ محض ایک گونگا ہیولیٰ ہے۔ فکر ہی کے ذریعے تجربات عمل میں آتے ہیں۔ تم نگاہ کو تمام حواس پر قیاس کر لو۔ سب کے سب گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ تفکّر ہی حواس کو سماعت اور بصارت دیتا ہے۔ سمجھایہ جاتا ہے کہ حواس تفکّر سے الگ کوئی چیز ہے حالانکہ تفکّر سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان محض تفکّر ہے۔ فرشتہ محض تفکّر ہے۔ جن محض تفکّر ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر ذی ہوش تفکّر ہے۔

فرمایا کہ اس گفتگو میں ایک ایسا مقام آجاتا ہے جہاں کائنات کے کئی راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ غور سے سنو، ہمارے تفکّر میں بہت سی چیزیں ابھرتی رہتی ہیں۔ دراصل ؤ

باہر سے آتی ہیں۔ انسان کے علاوہ کائنات میں اور جتنے تفکّر ہیں جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا ہے۔ فرشتے اور جنّات۔ ان سے انسان کا تفکّر اسی طرح متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح انسان خود اپنے تفکّر سے متاثر ہوتا ہے۔ قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ لامتناہی تفکّر سے متناہی تفکّر کو فیضان پہنچاتی رہتی ہے۔ پوری کائنات میں اگر قدرت کا یہ فیضان جاری نہ ہو تو کائنات کے افراد کا یہ درمیانی رشتہ کٹ جائے۔ ایک تفکّر کا دوسرے تفکّر کو متاثر کرنا بھی قدرت کے اس طرزِ عمل کا ایک جزو ہے۔ انسان پابہ گِل ہے۔ جنّات پابہ ہیولیٰ ہیں، فرشتے پابہ نور۔ یہ تفکّر تین قسم کے ہیں اور تینوں کائنات ہیں۔ اگر یہ تینوں مربوط نہ رہیں اور ایک تفکّر کی لہریں دوسرے تفکّر کو نہ ملیں تو ربط ٹوٹ جائے گا اور کائنات منہدم ہو جائے گی۔

ثبوت یہ ہے کہ ہمارا تفکّر ہیولیٰ اور ہیولیٰ قسم کے تمام جسموں سے فکری طور پر روشناس ہے۔ ساتھ ہی ہمارا تفکّر نور اور نور کی ہر قسم سے بھی فکری طور پر روشناس ہے حالانکہ ہمارے اپنے تفکّر کے تجربات پابہ گِل ہیں۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ ہیولیٰ اور نور کے تجربات اجنبی تفکّر سے ملے ہیں۔

عام زبان میں تفکّر کو اَنا کا نام دیا جاتا ہے اور اَنا یا تفکّر ایسی کیفیات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کو مجموعی طور پر فرد کہتے ہیں۔ اس طرح کی تخلیق ستارے بھی ہیں اور ذرّے بھی۔ ہمارے شعور میں یہ بات یا تو بالکل نہیں آتی یا بہت کم آتی ہے کہ تفکّر کے ذریعے ستاروں ذرّوں اور تمام مخلوق سے ہمارا تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اَنا یعنی تفکّر کی لہریں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس قسم کے تبادلۂ خیال کا ایک خاندان ہے۔ مخلوق میں فرشتے اور جنّات ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ تفکّر

کے اعتبار سے ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ اور تبادلۂ خیال کے لحاظ سے ہم سے زیادہ
مانوس ہیں۔"

نانا تاج الدین اس وقت ستاروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے "کہکشانی
نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے در پے جو خیالات ہمارے ذہن
میں آتے ہیں وہ دوسرے نظاموں اور ان کی آبادیوں سے ہمیں وصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ
خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے لاشمار
تصویر خانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویر خانوں کو ہم اپنی زبان میں توہم، خیال، تصور اور تفکر
وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ ہماری اپنی اختراعات ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے
بلکہ تمام مخلوق کی سوچنے کی طرزیں ایک نقطۂ مشترک رکھتی ہیں۔ وہی نقطۂ مشترک تصویرخانوں کو
جمع کر کے ان کا علم دیتا ہے۔ یہ علم نوع اور فرد کے شعور پر منحصر ہے۔ شعور جو اسلوب اپنی انا
کی اقدار کے مطابق قائم کرتا ہے تصویر خانے اس ہی اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تین نوعوں کے طرزِ عمل میں زیادہ اشتراک ہے۔
ان ہی کا تذکرہ قرآن پاک میں انسان، فرشتہ اور جنّات کے نام سے کیا گیا ہے۔
یہ نوعیں کائنات کے اندر سارے کہکشانی نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ قدرت نے کچھ ایسا
نظام قائم کیا ہے جس میں یہ تین نوعیں تخلیق کا رکن بن گئی ہیں۔ ان ہی کے ذہن سے تخلیق کی لہریں
خارج ہو کر کائنات میں منتشر ہوتی ہیں اور جب یہ لہریں معین مسافت طے کر کے معین نقطہ پر
پہنچتی ہیں تو کائناتی مظاہر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ تفکر، انا اور شخص ایک ہی چیز ہے۔ الفاظ کی وجہ سے ہم ان میں
معانی کا فرق نہیں کر سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انا، تفکر اور شخص ہیں کیا؟ یہ وہ

ہستی ہیں جو لاشمار کیفیات کی شکلوں اور سراپا سے بنی ہیں مثلاً بصارت، سماعت، تکلم،
محبت، رحم، ایثار، رفتار، پرواز وغیرہ۔ ان میں ہر ایک کیفیت ایک شکل اور سراپا
رکھتی ہے۔ قدرت نے ایسے بے حساب سراپا لے کر ایک جگہ اس طرح جمع کر دیئے ہیں کہ
الگ الگ پرت ہونے کے باوجود ایک جان ہو گئے ہیں۔ ایک انسان کے ہزاروں جسم
ہوتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جنّات اور فرشتوں کی بھی یہی ساخت ہے۔ یہ تینوں ساخت
اس لئے مخصوص ہیں کہ ان میں کیفیات کے پرت دوسرے انواع سے زیادہ ہیں۔ کائنات
کی ساخت میں ایک پرت بھی ہے اور کثیر تعداد پرت بھی ہیں۔ تاہم ہر نوع کے افراد میں مساوی
پرت ہیں۔

انسان لاشمار ستاروں میں آباد ہیں۔ اور ان کی قسمیں کتنی ہیں اس کا اندازہ قیاس
سے باہر ہے۔ یہی بات فرشتوں اور جنّات کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ انسان ہوں، جنّات
ہوں یا فرشتے، ان کے سراپا کا ہر فرد ایک پائندہ کیفیت ہے۔ کسی پرت کی زندگی جلی
ہوتی ہے یا خفی۔ جب پرت کی حرکت جلی ہوتی ہے تو شعور میں آجاتی ہے، خفی ہوتی ہے
تو لاشعور میں رہتی ہے۔ جلی حرکت کے نتائج کو انسان اختراع و ایجاد کہتا ہے
لیکن خفی حرکت کے نتائج شعور میں نہیں آتے۔ حالاں کہ وہ زیادہ عظیم الشان اور
مسلسل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ راز غور طلب ہے کہ ساری کائنات خفی حرکت کے نتیجے میں
رونما ہونے والے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ البتہ یہ مظاہر محض انسانی لاشعور کی پیداوار
نہیں ہیں۔ انسان کا خفی کائنات کے دور دراز گوشوں سے مسلسل ربط قائم نہیں رکھ سکا۔
اس کمزوری کی وجہ نوع انسان کے اپنے خصائل ہیں۔ اس نے اپنے تفکر کو کس مقصد
کے لئے پابند کیا ہے یہ بات اب تک نوعِ انسانی کے شعور سے ماوراء ہے۔ کائنات

میں جو تفکر کام کر رہا ہے اس کا تقاضا تھا کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کر سکی جو زمانی، مکانی فاصلوں کی گرفت میں بے دست و پا ہو۔ اس شکل میں ایسی تخلیق کی ضرورت تھی جو اُس کے خالی گوشوں کو مکمل کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ چنانچہ کائناتی تفکر سے جنّات اور فرشتوں کی تخلیق عمل میں آئی تاکہ خلا پُر ہو جائے۔ فی الواقع انسانی تفکر سے وہ تمام مظاہر رُونما نہیں ہو سکے جن سے کائنات کی تکمیل ہو جاتی۔

کائنات زمانی مکانی فاصلوں کا نام ہے۔ یہ فاصلے اَنا کی چھوٹی بڑی مخلوط لہروں سے بنتے ہیں۔ ان لہروں کا چھوٹا بڑا ہونا ہی تغیّر کہلاتا ہے۔ دراصل زمان اور مکان دونوں اسی تغیّر کی صورتیں ہیں۔ دخان جس کے بارے میں دنیا کم جانتی ہے اس مخلوط کا نتیجہ اور مظاہر کی اصل ہے۔ یہاں دخان سے مراد دھواں نہیں ہے۔ دھواں نظر آتا ہے اور دخان ایسا دھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔ انسان مثبت دخان کی اور جنّات منفی کی پیداوار ہیں۔ رہا فرشتہ، ان دونوں کے ملخّص سے بنا ہے۔ عالمین کے یہ تین اجزائے ترکیبی غیب و شہود کے بانی ہیں۔ ان کے بغیر کائنات کے گوشے امکانی تموّج سے خالی رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ہمارا شعور اور لاشعور حیات سے دُور نابود میں گم ہو جاتا ہے۔ ان تین نوعوں کے درمیان عجیب و غریب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ مثبت دخان کی ایک کیفیت کا نام مٹھاس ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار انسانی خون میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دخان کی منفی کیفیت نمکین ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار جنّات میں پائی جاتی ہے۔ ان ہی دونوں کیفیتوں سے فرشتے بنے ہیں۔ اگر ایک انسان میں مثبت کیفیت کم ہو جائے اور منفی بڑھ جائے تو انسان میں جنّات کی تمام صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور وہ جنّات کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی جن میں مثبت کیفیت بڑھ جائے اور منفی

کیفیت کم ہو جائے تو اس میں ثقل وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ فرشتہ پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ اگر مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے اُوپر آ جائیں تو مثبت کے زور پر وہ انسانی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے اور منفی کے زور پر جنّات کی۔ بالکل اسی طرح اگر انسان میں مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے کم ہو جائیں تو اس سے فرشتہ کے اعمال صادر ہونے لگیں گے۔

طریق کار بہت آسان ہے۔ مٹھاس اور نمک کی معین مقداریں کم کر کے فرشتوں کی طرح زمانی مکانی فاصلوں سے وقتی طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔ محض مٹھاس کی مقدار کم کر کے جنّات کی طرح زمانی مکانی فاصلے کم کر سکتے ہیں لیکن ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی رُوحانی انسان کی رہنمائی اشد ضروری ہے۔

شیر کی عقیدت

ایک دن واکی شریف کے جنگل میں پہاڑی ٹیلے پر چند لوگوں کے ہمراہ چڑھتے چلے گئے۔ نانا رحمۃ اللہ علیہ مسکرا کر کہنے لگے "میاں جس کو شیر کا ڈر ہو وہ چلا جائے، میں تو یہاں ذرا سی دیر آرام کروں گا۔ خیال ہے کہ شیر ضرور آئے گا۔ جتنی دیر قیام کرے اس کی مرضی۔ تم لوگ خواہ مخواہ انتظار میں مبتلا نہ رہو، جاؤ کھاؤ پیو اور مزہ کرو۔"

بعض لوگ ادھر اُدھر چھپ گئے اور زیادہ چلے گئے۔ میں نے حیات خاں سے کہا، کیا ارادہ ہے۔ پہلے تو حیات خاں سوچتا رہا۔ پھر زیرِ لب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سوال کیا۔ "چلنا ہے یا تماشا دیکھنا ہے؟"

"بھلا بابا صاحب کو چھوڑ کے میں کہاں جاؤں گا!" حیات خان بولا۔

گرمی کا موسم تھا۔ درختوں کا سایہ اور ٹھنڈی ہوا خمار کے طوفان اٹھا

رہی تھی۔

تھوڑی دور ہٹ کر میں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر جیسا خیال اس طرح بیٹھ گیا کہ نانا تاج الدین کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہے۔

اب وہ دبیز گھاس پر لیٹ چکے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ فضا میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ جنگل بھیانک محسوس ہونے لگا۔ آدھ گھنٹہ، پھر ایک گھنٹہ۔ اس کے بعد بھی کچھ وقفہ ایسے گزر گیا جیسے شدید انتظار ہو۔ یہ انتظار کسی سادھو، کسی جوگی، کسی ولی، کسی انسان کا نہیں تھا بلکہ ایک درندہ کا تھا جو کم از کم میرے ذہن میں قدم بقدم حرکت کر رہا تھا۔ یکایک نانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نگاہیں متوجہ ہوگئیں۔ اُن کے پیروں کی طرف ایک طویل القامت شیر ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ بڑی آہستہ خرامی سے، بڑے ادب کے ساتھ۔

شیر نیم وا آنکھوں سے نانا تاج الدین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر میں وہ پیروں کے بالکل قریب آگیا۔

نانا گہری نیند میں بے خبر تھے۔ شیر زبان سے تلوے چھو رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھیں مستانہ واری سے بند ہوگئیں۔ سر زمین پر رکھ دیا۔

نانا تاج الدین ابھی تک سو رہے تھے۔

شیر نے اب زیادہ جرأت کر کے تلوے چاٹنا شروع کر دیئے۔ اس حرکت سے نانا کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شیر کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ کہنے لگے "تو آگیا۔ اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں تجھے تندرست دیکھ کر

بہت خوش ہوں۔ اچھا اب جاؤ"۔ شیر نے بڑی ممنونیت سے دُم ہلائی اور چلا گیا۔

میں نے ان واقعات پر بہت غور کیا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ شیر پہلے کبھی ان کے پاس آیا تھا۔ مجبوراً اس امر کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ نانا اور شیر پہلے سے ذہنی طور پر روشناس تھے۔ روشناسی کا طریقہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اَنا کی جو لہریں نانا اور شیر کے درمیان ردّ و بدل ہوتی تھیں وہ آپس کی اطلاعات کا باعث بنتی تھیں۔ عارفین میں کشف کی عام روش بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جانوروں میں بھی کشف اسی طرح ہوتا ہے۔ کشف کے معاملے میں انسان اور دوسری مخلوق یکساں ہیں۔

یہ قانون بہت فکر سے ذہن نشیں کرنا چاہیئے کہ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دَور کرتے رہتے ہیں، ان میں بہت زیادہ ہمارے معاملات سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قریب اور دور کی ایسی مخلوق سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہو۔ اس مخلوق کے تصوّرات لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم اُن تصوّرات کا جوڑ اپنی زندگی سے ملانا چاہتے ہیں تو ہزار کوشش کے باوجود ناکام رہ جاتے ہیں۔ اَنا کی جن لہروں کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے ان کے بارے میں بھی چند باتیں فکر طلب ہیں۔ سائنس داں روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کر دے۔ البتہ اَنا کی لہریں لاتناہیت میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں۔ ان لہروں کے لئے زمانی مکانی فاصلے موجود ہی نہیں ہیں۔ روشنی کی لہریں جن فاصلوں کو کم کرتی ہیں، اَنا کی لہریں ان فاصلوں کو بجائے خود موجود ہی نہیں جانتیں۔

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی معین کر لئے جاتے ہیں، سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو اَنا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی اَنا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من و عن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

انبیاء اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں۔ ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے، چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب و شہود کی فراست اور معنویت کائنات کی رگِ جان ہے۔ ہم اس رگِ جاں میں جو خود ہماری اپنی رگِ جان بھی ہے، تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارے اور دوسرے سیاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصورات، جنات اور فرشتوں کی حرکات و سکنات، نباتات و جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کر سکتے ہیں۔

مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے

سراپا کا معین پرت اَنا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

پتے کیڑے بن گئے

اشکردرہ میں نانا تاج الدین ایک درخت کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ گھنٹوں چُپ رہتے۔ نگاہ نیچی کئے، گھٹنوں میں سر دیئے اس طرح جیسے کوئی مراقبہ کرتا ہو۔ لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ اور انتظار کرتے رہتے کہ وہ متوجہ ہوں۔ لیکن بعض دفعہ صبح سے شام ہو جاتی مگر ان کے سراپا میں کوئی حرکت نہ ہوتی۔ حاضرین بالآخر مایوس ہو کر واپس چلے جاتے۔

نانا علیہ الرحمۃ کی اس بے خودی کو حیات خاں چائے کی پیالی دے کر یا دوپہر کا کھانا پیش کر کے دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن بارہا ناکام ہو کر بی مریم کے پاس پہنچ جاتا اور افسردہ لہجے میں اپنی ناکامی کا تذکرہ کرتا: "بابا صاحب نے صبح سے چائے نہیں پی۔ میرا تو بس نہیں چلتا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ معلوم نہیں آج وہ کھانا بھی کھائیں گے یا نہیں۔"

اس کی بات سن کر بی مریم بھی دم بخود رہ جاتیں۔ دیر تک سوچتی رہتیں۔ پھر کہتیں "یہ استغراق ہے۔ کم بخت بابا صاحب کے پیچھے پڑ گیا ہے!"

وہ دونوں انتظار کرتے رہتے۔ دو دو تین تین دن گزر جاتے اور بے خودی ٹس سے مس نہ ہوتی۔ کھانا یا چائے تو ایک طرف پانی کا ایک قطرہ بھی ہونٹوں تک نہ جاتا۔ دور دراز سفر کر کے آئے ہوئے مسافر کوٹھی کے مہمان خانے میں پڑے رہتے۔ گرمی، سردی، بارش کی شدت برداشت کرتے لیکن بغیر حاضری کے جانے کا نام نہ لیتے۔

حیات خاں کا خیال تھا کہ بابا صاحب کے استغراق کی کشش لوگوں کے ذہن

میں انبساط کی لہر پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کو یقینِ کامل تھا کہ لوگوں کی خوشی کا ایک مرکز ضرور ہوتا ہے جو اُن کی اپنی ذات سے باہر خدا سے یا کسی شخصیت سے وابستگی رکھتا ہے۔ دراصل حیات خاں عقیدتمندی کی مسرتوں سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ اسی باعث وہ بطورِ خاص اِس تاثر کو تلاش کرتا اور لوگوں کے انتظار سے لطف اندوز ہوتا۔

حالتِ استغراق میں نانا تاج الدین کی آنکھیں کچھ کھلی رہتی تھیں۔ حیات خاں اکثر ان کی نیم باز آنکھیں عجیب ذوق و شوق سے دیکھتا۔ ایک مرتبہ استغراق کی حالت میں حیات خاں نے مجھے اشارے سے بلایا۔ کہنے لگا اس پتہ کو دیکھو۔ میری نظر یکے بعد دیگرے کئی پتوں پر گئی۔ جس پتہ کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس میں سے ٹانگیں، چہرے کے خدوخال اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں رُونما ہو رہی تھیں۔ یہ پتہ تقریباً تین اِنچ لمبا ہوگا۔ یکایک میری نظر برابر والے پتے پر جا پڑی۔ اس میں بھی ویسا ہی تغیر ہو رہا تھا۔ یہ دونوں پتے ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک دو منٹ میں ان کی ہیئت اتنی بدلی کہ پتوں کی کوئی شباہت ان میں باقی نہیں تھی۔ وہ درخت کے تنے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ اور نانا تاج الدین کی نیم وا آنکھیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد حیات خاں کئی دن تک ایک بھجن گنگناتا رہا جو اس بول سے شروع ہوتا ہے۔

پربھو دھن دھن قدرت تیری

کئی مہینے بعد میں نے نانا سے اس کی علمی توجیہہ معلوم کی۔ فرمایا: "ارے تو سمجھ بھی سکے گا۔ دیکھ یہ درخت ہے۔ اس کے اندر زندگی کے سارے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ دیکھنا، سننا، سمجھنا، جنبش کرنا۔ یہ سب ٹکڑے اس درخت کے اندر جھانکنے سے نظر آتے ہیں۔ اس کے ہر پتے میں پنچ پنچ کا منہ ہے، اپنچ اپنچ کے ہاتھ پیر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جب

تک پتہ دوسری زندگی سے ٹکراتا نہیں، اس کے اندر عام لوگ یہ نیرنگ دیکھ نہیں سکتے۔ اور جب کوئی پتہ میری زندگی سے گلے ملتا ہے تو جیتا جاگتا کیڑا بن جاتا ہے۔ یہ سمجھ کہ آنکھ سے بھی گلے ملتے ہیں۔ یاد رکھ زندگی سے زندگی بنتی ہے اور زندگی زندگی میں سما جاتی ہے۔"

دیوار میں سے گزر جانا

جس زمانہ میں والد صاحب دلی ٹول ٹیکس میں محرِّر تھے، ہمارے مکان کی ایک دیوار بارش میں گر گئی۔ مکان دار برسات میں مرمت کرانے کے لئے تیار نہ تھا۔ نانا تاج الدین نے والد کو خط لکھا کہ بھابی اور بچی سعیدہ کو ناگپور پہنچا دو۔ ان ایام میں وہ راجہ رگھو راؤ کے پاس مقیم تھے۔ ہم لوگوں کے لئے شطرنج پورہ میں رہائش کا انتظام کیا گیا۔ روزانہ یا دوسرے دن نانا اپنی گھوڑا گاڑی میں یہاں تشریف لاتے۔ گھنٹوں ہمارے ساتھ گزارتے۔ اکثر اِرد گرد کی آبادی کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ نانا ان کے معاملات پر غور کرنے میں اتنا دماغ صرف کر دیتے کہ حواس ماؤف ہو جاتے۔ ایک بار بے خیالی میں دروازے کی طرف جانے کی بجائے وہ دیوار کے پیچھے کھڑی ہوئی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھتے چلے گئے اور ٹھوس دیوار سے گزر کر سڑک پر نکل گئے۔ غالباً یہ کرامت ان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوئی۔ لوگوں کے معاملات سے متعلق سوچنے میں ان کا ذہن تجلّیِ الٰہی میں تحلیل ہو گیا اور جسم ذہن کے تابع ہونے کی وجہ سے ثقل کی منزل سے آگے نکل گیا۔

۲ برس کا چلّہ

نانا تاج الدین فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ساگر ڈپو میں تعینات کئے گئے۔ رات کے ۹ بجے گنتی سے فارغ ہو کر بابا داؤد مکی کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ وہاں صبح تک مراقبہ اور مشاہدہ میں مصروف رہتے اور صبح سویرے پریڈ کے وقت ڈپو پہنچ جاتے۔ یہ مشغلہ پورے دو برس تک جاری

رہا۔ دو برس بعد بھی ہفتہ میں ایک دو بار ان کے یہاں حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ جب تک ساگر میں رہے اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ چلّہ کشی کے ابتدائی دور میں ڈوٹ نام کا ایک مغلوبُ الغضب کرنل ڈپو کا کمانڈر مقرر ہوا۔ شدہ شدہ نانا کا رات کے وقت مزار پر جانا اس کو بھی معلوم ہو گیا۔ چنانچہ یونٹ صوبے دار سے باز پرس کی نوبت آ گئی۔ وہ سادات بارہ میں سے تھا۔ اور مزاج کا بڑا سخت تھا۔ اس نے کمانڈر سے بالکل صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اپنے یونٹ کے ہر فرد کا خود ذمہ دار ہوں۔ جب تک سرکاری کاموں میں حرج واقع نہ ہو میں کسی کے نجی معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا۔ رہا رات کے وقت ڈپو سے باہر جانے کا مسئلہ تو اس کے لئے ان کو پاس ملا ہوا ہے۔

مسلسل دو برس تک تمام رات جاگنا اور تمام دن کام کرنا بھی ان کی کرامت ہے۔

ایک صحابی رض نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں اپنی طویل شب بیداری کے تذکرے میں عرض کیا۔ "یارسول اللہ! میں آسمان پر فرشتوں کو چلتے پھرتے دیکھتا تھا۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم شب بیداری کو اور قائم رکھتے تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

اس روایت کی روشنی میں اگر نانا تاج الدین کی مسلسل شب بیداری پر غور کیا جائے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غیبی مشاہدات اُن کا معمول بن گئے تھے۔ ان کے کئی دوہے اسی مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک

یہ ہے:

سائے بن کی رات میں بن باسی بن جائیں
واس ملو کا ساتھ میں جاگیں اور لہرائیں

مطلب: جنگل کی رات میں سائے آدمی بن جاتے ہیں۔ تاج الدین ان کے ساتھ جاگتے رہتے ہیں اور خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔

نانا کویتا میں اپنا نام واس ملوکا لیا کرتے تھے۔

تنکے بیڑی بن جاتے تھے

تحقیق و تلاش کے بعد بھی نانا تاج الدین کا سال پیدائش معلوم نہیں ہو سکا۔ بڑے نانا کی حیات میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا۔ والد صاحب کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے بڑے نانا کی زبانی یہ سنا ہے کہ تاج الدین کی عمر غدر میں چند سال تھی۔ لڑکپن میں انہیں پڑھنے کے علاوہ کوئی شوق نہیں تھا۔ بیڑی پینا کب سے شروع کیا اس کے بارے میں صحیح بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ شکردرہ کے قیام میں بیڑی اور چائے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض اوقات بیڑیاں ختم ہو جاتیں تو بیڑی کا پڑا ہوا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا کرتے تھے۔ کسی وقت بیڑی کا ٹوٹا بھی نہیں ملتا تھا۔ پھر اُن کی طبیعت خرقِ عادات کی طرف مائل ہو جاتی۔ جو تنکا ہاتھ میں آجاتا اس کو سلگا لیتے۔ لوگوں نے بارہا دیکھا کہ تنکے نے بیڑی کی شکل اختیار کر لی اور بیڑی کی طرح دھواں دینے لگا۔

لنگڑا بیساکھی چھوڑ بھاگا

ایک لنگڑا نوجوان شفاخانے میں آکر ٹھہر گیا۔ یہ شفاخانہ بھی مسجد اور مدرسہ کی طرح پھونس کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ لنگڑا صبح کھا پی کر شفاخانے سے چلتا اور نانا تاج الدین کے

سامنے آبیٹھتا۔ سلام کرکے لنگڑی ٹانگ پھیلا کر اپنا ہاتھ پھیرنے لگتا اور ایسا منہ بناتا کہ جیسے بڑی تکلیف میں ہے۔ نانا "ہوں" کہہ کر چُپ ہوجاتے۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ لنگڑا تھا بڑا اڑیل، اپنے معمول پر قائم رہا۔ ایک روز غصہ میں بھرا ہوا آیا اور نانا کی طرف دیکھ کر بڑبڑانے لگا: "خدا نے مجھے لنگڑا کر دیا۔ جن کی ٹانگیں ہیں ان کو کچھ احساس نہیں۔ سنا تھا کہ خدا کے یہاں انصاف ہے۔ انصاف کو بھی جھنجوڑ کر دیکھ لیا۔ سب ڈھونگ ہے۔ لوگ خد خدا پکارتے ہیں اور خدا بہرا ہوگیا ہے، کچھ نہیں سُنتا۔ خدا والوں کو بھی دیکھ لیا۔ یہ بھی سب گونگے بہرے ہیں۔ خدا اور خدا والوں سے تو میری بیساکھی اچھی ہے۔ سہارا تو دیتی ہے۔"

نانا اس کی باتیں سُن کر جھنجھلا گئے۔ چیخ کر بولے "جا دفان ہو۔ بھلا چنگا ہو کر لنگڑا بنتا ہے، جھوٹا کہیں کا۔" اور یہ کہہ کر لنگڑے کو مارنے کے لئے دوڑے۔ لنگڑا جب کبھی چھوڑ بھاگا۔ اب اس کی لنگڑی ٹانگ بالکل ٹھیک تھی۔

انسان علی شاہ نانا کے فیض یافتہ تھے۔ ان کو روحانی علوم پر عبور تھا اور سوچنے کی طرز بھی نانا سے ملتی تھیں۔ انہوں نے نانا کی حیات میں ترکِ وطن کرکے شکردرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے لنگڑے کا واقعہ زیرِ بحث آگیا۔

انسان علی شاہ کہنے لگے: "اس واقعہ کی توجیہ مشکل نہیں۔ یہ سمجھنا کہ کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے غلط ہے۔ یہاں ہر چیز صدوری طور پر ہوتی ہے۔ وقت صرف انسان کی اندرونی واردات ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ذات کے علاوہ کوئی شے اندرونی واردات کی حد سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء کے مرحلے اندرونی واردات ہی کے اجزاء ہیں۔ یہ واردات ہی نوعی سراپا کی نقلیں افراد کی شکل وصورت میں چھاپتی ہیں۔ چھپائی کی رفتار معین ہے۔ اسی رفتار کا نام وقت ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہوجائے تو لنگڑا، لولا، اندھا چھپنے لگتا ہے۔ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔

جب عارف کا ذہن ایک آن کے لئے صدوری کیفیت میں داخل ہوجاتا ہے تو یہ بے اعتدالیاں دُور ہوجاتی ہیں۔"

گوالا زندہ ہوگیا

گلاب سنگھ نے نانا تاج الدین کی چائے کے لئے ایک بھینس کا دُودھ وقف کر رکھا تھا۔ اکثر خود ہی دودھ لے کر آتا اور چھان کر جوش کرنے کے لئے رکھ جاتا۔ وہ سن گیارہ سے یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ سن سترہ کی برسات میں ایک صبح دُودھ نہیں آیا۔

نانا نے دن چڑھے تک انتظار کرنے کے بعد حیات خاں سے کہا: "کیا آج چائے نہیں ملے گی؟"

حیات خاں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا: "میں تو بہت سویرے سے گلاب سنگھ کا انتظار کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیا بپتا پڑ گئی۔ ابھی تک دودھ نہیں لایا۔ حکم ہو تو بازار سے لے آؤں۔"

نانا بگڑ کر بولے: "پھر تو نے اس کی خبر کیوں نہیں لی۔ جا کے آ۔"

حیات خاں گاؤں کی طرف دوڑا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر گلاب سنگھ کی ارتھی پر پڑی۔ لوگ کریا کرم کے بندوبست میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے یہ آواز سنی: "بابا صاحب کا گوالا مر گیا۔"

حیات خاں پریشان ہوکر اُلٹے پاؤں دوڑا۔

نانا تاج الدین راستہ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر گوگیر

آواز میں بولا: "گلاب سنگھ مر گیا"
نانا یہ سن کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ حیات خاں اور چند آدمی ان کے ساتھ تھے۔ آنکھوں سے جلال برس رہا تھا۔ ارتھی کے قریب پہنچ کر انہوں نے پکارنا شروع کیا: "گلاب سنگھ! گلاب سنگھ!"

بہت غصہ میں ہجوم سے بولے: "اسے کھول دو۔ یہ زندہ ہے"
اس کے بھائی نے دوڑ کر ارتھی کی ڈوریاں کاٹ ڈالیں۔ آن کی آن میں گلاب سنگھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن گلاب سنگھ حسبِ معمول دودھ لے کر آیا تو لوگوں نے اُسے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

اب سنیئے گلاب سنگھ کی کہانی اُسی کی اپنی زبانی۔

"بوندوں میں بھیگنے سے مجھے تپ چڑھ گئی۔ بدن جلنے لگا۔ کچھ لوگ اڑتے ہوئے آئے اور مجھے اس دنیا سے دوسری دنیا میں لے گئے۔ میں کئی گھنٹے تک ایک ہرے بھرے میدان میں گھومتا رہا۔ اس کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ کانٹے دار جنگل میں گم ہو گیا اور دوسرے راستے میں آبادیاں تھیں۔ چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچا جہاں بہت سی عدالتیں لوگوں سے بھری پڑی تھیں۔ ان ہی عدالتوں میں اونچی کرسی کی ایک عمارت دیکھنے میں آئی جس کے دروازے بڑے بڑے تھے۔

میں نے دیکھا بابا صاحب ایک دروازے میں کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر وہ محراب کی طرف بڑھے۔ یہاں تخت پر دو جگ کے تاج دار، انبیاء کے سرتاج (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تشریف رکھتے تھے۔ بابا صاحب تخت کے سامنے ٹھہر گئے اور

سر جھکا کر درخواست کی۔
"میرے آقا! گلاب سنگھ کی واپسی کا حکم دیا جائے"
"نہیں" بارگاہِ نبوی سے ارشاد ہوا۔
بابا صاحب پھر سوچ میں پڑ گئے۔ چند منٹ بعد ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔
"اگر یہ درخواست قبول نہیں ہو سکتی تو غلام حضور کے بخشے ہوئے پیرہن کا مستحق نہیں" یہ کہہ کر بابا صاحب کرتہ اتارنے لگے۔
سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے ایک نظر دیکھ کر فرمایا۔
"گلاب سنگھ! تم جا سکتے ہو"

منقبت

بحضور تاج الاولیاء بابا تاج الدین ناگپوریؒ

یا بابا تاج الدین ولی ، تم زلفِ نبیؐ، گیسوئے علیؓ
تم لاڈلے بی بی زہراؓ کے، تم روئے حسینؓ ابروئے علیؓ

پروردہ نازِ خدا تم ہو، سرکردہ رازِ خدا تم ہو
گلزارِ نیازِ خدا تم ہو، خوشبوئے حسنؓ خوشبوئے علیؓ

اس دور کے اندر جانا ہے، اس دور کے اندر سمجھا ہے
تم سے ہے جمالِ مصطفویؐ، تم سے ہے جلالِ خوئے علیؓ

تم ختمِ رسلؐ کا نقشِ قدم، تم شمع عرب، تم شمع عجم
تم سِرِّ خفی و جلی باہم، مہکی ہے تم سے بوئے علیؓ

یہ آپ ہی کا تو نواسہ ہے، دریا پی کر جو پیاسا ہے
جلووں کا سمندر دے دیجئے، اے بادۂ حق اے جوئے علیؓ

قلندر بابا اولیاءؒ